ماہنامہ

آنکھ مچولی

کراچی

جولائی ۱۹۹۵ء

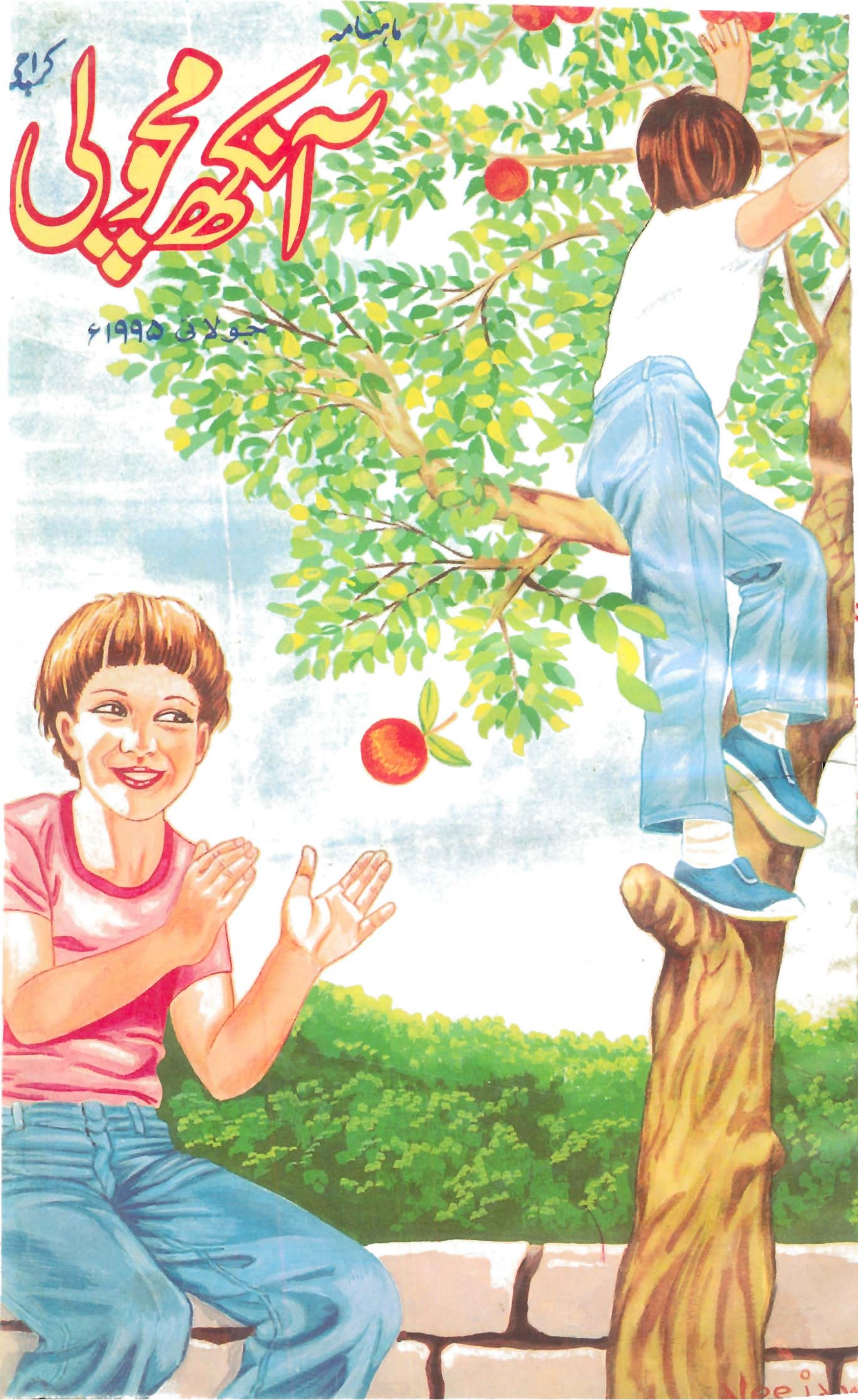

فرحت، ٹھنڈک
اور تازگی کے ساتھ...
کوئس®
ٹیٹرا پیک ڈرنکس
واہ! کیا مزہ
QUICE
MIXED FRUIT
عصیر المنجۃ
شراب آنکریو
شراب قیمتو
عصیر التفاح
عصیر الفواکیۃ
کوئس فوڈ انڈسٹریز لمیٹڈ
ہیڈ آفس: 11/139 جمال الدین افغانی روڈ۔ نزد بہادر آباد، شرف آباد۔ کراچی فون: 4933061 - 4944529

تاریخِ عالم کی بحرالعلوم مسلم شخصیت ابوریحان محمد ابن احمد البیرونی نے سب سے پہلے رہنمائی دی کہ روشنی کی رفتار آواز کی رفتار سے تیز ہے۔ یہ بنیادی علم سائنسی ترقی میں بے شمار اختراعات و ایجادات کا سبب بنا۔ البیرونی نے جہلم کی پہاڑی تندنا پر بیٹھ کر دنیا کا قطر ناپا اور ½ ۷۷۸,۲۴ میل بتایا جو حیرت انگیز طور پر صحیح ہے۔ نباتات اور جواہرات پر البیرونی کی تحقیقات کو اساسی حیثیت حاصل ہے۔ ریاضی داں، فلسفی، ماہر جغرافیہ البیرونی ایک سیاح کی حیثیت سے بھی معروف ہیں اور یگانۂ وقت مورّخ کے طور پر بھی۔ فارسی اور عربی زبانوں میں ان کی ایک سو سے زیادہ معرکہ آرا تصانیف ہیں۔

رُوحِ فکر

حقائقِ دنیا سے آگاہی اور نباتات، جواہرات و عناصر کے عمیق علم نے اور روشنیٔ حکمت و صنعت نے مقبولِ عالم رُوح افزا کو وجود دیا ہے اور اسی وفورِ نور نے مصنوعاتِ ہمدرد کو سامانِ صحّت و شفا بنایا ہے۔ ہمدرد اس حقیقت سے آگاہیٔ کامل کے ساتھ خدمتِ انسان میں مصروف ہے اور منہمک۔

مدینۃ الحکمۃ
تعلیم، سائنس اور ثقافت کا عالمی منصوبہ۔
آپ ہمدرد دوست ہیں۔ اعتماد کے ساتھ مصنوعاتِ ہمدرد خریدتے ہیں۔ جائز منافع بین الاقوامی شہرِ علم و حکمت کی تعمیر میں لگ رہا ہے۔ اس کی تعمیر میں آپ بھی شریک ہیں۔

نباتات کا مرکب **رُوح افزا** ہمدرد
مشروبِ مشرق

Adarts-HRA-16/95

کوئی ایسا تحفہ لائے
جو دل میں پھول کھلائے
احمد
فریش اویل
بہترین حلوے کے تین
فریش ویل
کراچی حلوہ
فریش ویل
حبشی حلوہ
فریش ویل
سوہن حلوہ
سوہن حلوہ - حبشی حلوہ - کراچی حلوہ
احمد فوڈ انڈسٹریز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
ڈی-۱۱۳، نورس روڈ، سائیٹ، کراچی
MASS

ماہنامہ
آنکھ مچولی
کراچی

صفر/ربیع الاول ۱۴۱۶ ۱۹۹۵ء

جلد ۱۰

شمارہ ۱

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

رکن پاکستان چلڈرنز میگزین سوسائٹی

آڈٹ بیورو آف سرکولیشن سے تصدیق شدہ اشاعت

مدیر اعلیٰ
ظفر محمود شیخ

منتظم اعلیٰ
تجمل حسین چشتی

مدیر اعزازی
طاہر مسعود

مجلس ادارت
منیر احمد راشد، محمد عمر احمد خان

منیجر اشتہارات
عمران احمد

مصور
مومن رحیم

فون نمبر: ۴۹۴۲۸۵۷ ۴۹۴۸۲۱۰

ماہ نامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی جاسکتی

ماہ نامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن وحدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار وواقعات فرضی ہیں کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا

ماہ نامہ آنکھ مچولی کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن کے زیر سرپرستی بچوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں میں اضافے اور سیرت وکردار کی تعمیر کے لیے شائع کیا

خط وکتابت کا پتہ: ماہنامہ آنکھ مچولی۔ گرین گائیڈ اکیڈمی ۱۰۔ پی آئی بی کالونی، کراچی ۵

قیمت: ۱۶ روپے
۷ درہم ۷ ریال

ناشر: ظفر محمود شیخ طابع: زاھد علی۔ مطبع لاریب پرنٹنگ پریس، ایم اے جناح روڈ کراچی

خوف کی اِک اور وادی کا سفر
ہو رہا ہے آپ کے اِصرار پر

پہلے سے زیادہ خوفناک کہانیوں، واقعات، حادثات اور مضامین کے جلوس کے ساتھ

آنکھ مچولی کا ایک اور

خوفناک نمبر

ستمبر ۱۹۹۵ء میں شائع ہو رہا ہے۔

مگر اس خوفناک نمبر کے لئے آپ بھی تو کچھ لکھیئے، مثلاً

- کوئی خوفناک کہانی یا واقعہ،
- کوئی سنسنی خیز نظم یا حادثہ
- دہشت سے متعلق کوئی مضمون
- کوئی دل ہلا دینے والی داستان
- یا کوئی خوفناک تصویر

لفظ لفظ خوف سے تھرتھراتا ہوا۔ حرف حرف ہیبت سے پھڑپھڑاتا ہوا

جلدی کیجئے

خوفناک نمبر کیلئے بے خوف ہو کر لکھئے آنکھ مچولی آپ کی تحریروں کا منتظر ہے

ہر قابلِ اشاعت تحریر کا معاوضہ دیا جائے گا۔۔۔

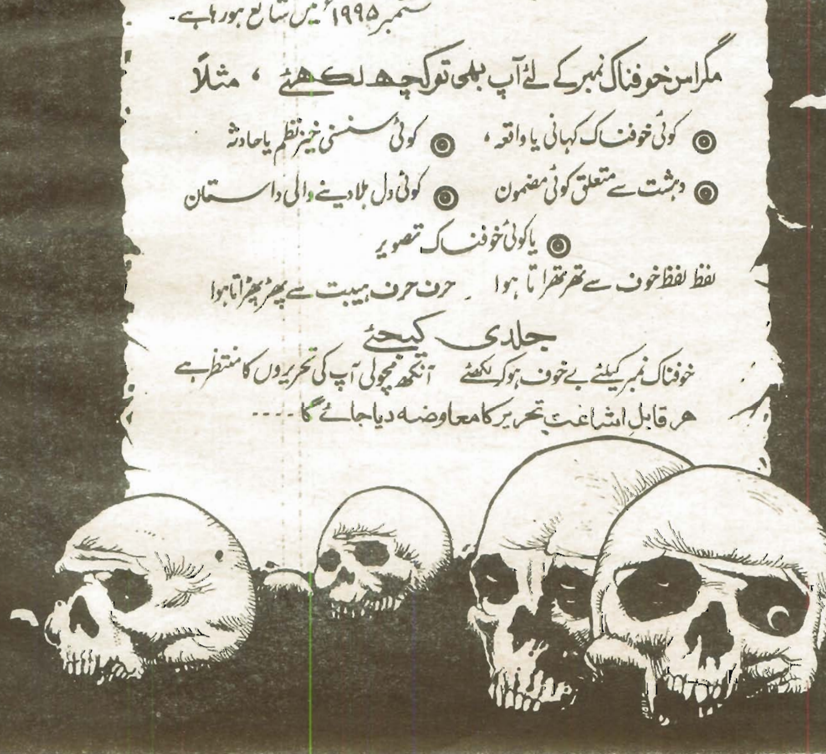

سنہرے حروف	ادارہ	۸
ماہِ رواں کی پہلی بات	اداریہ	۹
حمدِ باری تعالیٰ (نظم)	محمد شاہد فیروز	۱۰
ڈاکو سے صحابی تک	شہناز بانو	۱۱
میم سے مُنہ	آصف وقار آصف	۱۷
ایک تھی اماں	فصیح باری خان	۲۰
جھیلیں اور آبشار	نگہت آراء چوہان	۳۱
پڑھیئے گر بیمار	نائلہ صدیقی	۳۳
دُنیا تباہ ہو رہی ہے	فرزانہ روحی	۳۸
وَالصُّلحُ خیر (نظم)	محمد جاوید خالد	۴۴
فاتح	سلمان غزالی	۴۵
میرے بچپن کے دن	سلیم خالق	۵۰
خلاء کی تسخیر	قرۃ العین طاہر	۵۷
بارش کی دُعا (نظم)	معین تابش	۶۰
مستقبل کا خوف	قرۃ العین	۶۱
مرزا محمد رفیع سودا	ڈاکٹر اسلم فرخی	۶۵
وفادار دوست	عروج احمد خان	۷۰
راکٹ کی کہانی	ادارہ	۷۵
ٹھنڈی موت	ریحانہ منیر	۷۷
مزدور (نظم)	ضیغم حمیدی	۸۴
سوال آدھا جواب آدھا	محمد بن مالک	۸۵
ہنستے ہنستے	منتخب لطائف	۸۷
بنام آنکھ مچولی	خطوں کے جواب	۹۱
اداس بستی (نظم)	مجاہد حسین باسط	۹۵
اب میں کیا کروں؟	ادارہ	۹۶
کولمبس کہاں دفن ہے	عبدالستار خان طاہر	۹۷
حل کا حل	ادارہ	۱۰۰
کہانی انسان کی	اسحاق منصوری	۱۰۲
قلم دوست	ننھی تحریریں	۱۰۷

سنہرے حروف

دو مسافر ایک ساتھ سفر کر رہے تھے۔ ایک کے پاس پانچ روٹیاں تھیں اور دوسرے کے پاس تین۔ راستے میں ایک تیسرا مسافر بھی ان کا ساتھی ہو گیا۔ کھانے کا وقت ہوا تو تینوں نے روٹیاں برابر بانٹ کر کھالیں۔ تیسرے مسافر نے ان سے بچھڑتے وقت انہیں کھانے کی قیمت آٹھ درہم ادا کردی۔ پانچ روٹیوں والے مسافر نے تین روٹیوں والے مسافر کو اس میں سے تین درہم دینے چاہے مگر اس نے تین درہم لینے سے انکار کیا۔ اور کہا کہ مجھے برابر کا حصہ یعنی چار درہم دو۔ اس بات پر ان میں جھگڑا ہو گیا۔

وہ دونوں فیصلے کے لئے حضرت علیؓ کے پاس پہنچے۔ حضرت علیؓ نے تین روٹی والے مسافر کو مشورہ دیا کہ وہ تین درہم قبول کر لے۔ لیکن وہ اپنی بات پر اڑا رہا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا : "اچھا اگر نہیں مانتے تو میرا فیصلہ یہ ہے کہ تمہیں صرف ایک درہم اور تمہارے ساتھی کو سات درہم ملنے چاہئیں۔ ہر روٹی کے تین برابر برابر ٹکڑے کئے جائیں تو آٹھ روٹیوں کے چوبیس ٹکڑے ہوں گے۔ تم تینوں مسافروں میں سے ہر ایک نے آٹھ آٹھ ٹکڑے کھائے جس مسافر کے پاس شروع میں تین روٹیاں تھیں۔ نو ٹکڑوں میں سے آٹھ اس نے خود کھالیے جو ایک ٹکڑا بچا وہ تیسرے مسافر نے کھایا، جس مسافر کے پاس پانچ روٹیاں تھیں، اس نے ان کے پندرہ ٹکڑوں میں سے آٹھ ٹکڑے خود کھائے اور جو سات ٹکڑے بچے وہ تیسرے مسافر نے کھائے۔ لہٰذا تین روٹیوں والے مسافر کو ایک ٹکڑے کی قیمت ایک درہم اور پانچ روٹیوں والے مسافر کو سات ٹکڑوں کی قیمت سات درہم ملنی چاہئے۔

تین روٹیوں والا مسافر عقل و دانش پر مبنی یہ فیصلہ سن کر دنگ رہ گیا لیکن اس انصاف کے سامنے سر جھکانے کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔

پہلی بات

☆ تیرہ سالہ فہد گھر سے اسکول کے لئے نکلا اور لوٹ کر نہیں آیا۔ دوپہر میں اس کی لاش ایک خالی مکان میں پڑی ہوئی ملی۔ اسے قتل کردیا گیا تھا۔

☆ ننھا نعمان اپنے والدین کے ساتھ کلفٹن کے بارونق بازار میں گاڑی پر سوار تھا۔ تین دہشت گردوں کی فائرنگ سے ہلاک ہوگیا۔

☆ جہاں زیب، عمر سات سال، جہانگیر آباد میں اپنے گھر کے سامنے کھیل رہا تھا کہ نامعلوم سمت سے گولی اس کے سر میں آکر لگی۔ فوراً" ہسپتال لے جایا گیا جہاں "وہ زخموں کی تاب نہ لاکر چل بسا"

☆ دہشت گردوں کی فائرنگ سے ہلاک ہونے والے ۱۱ سالہ عمران کی لاش کو اس کے گھر والے پوسٹ مارٹم کرائے بغیر زبردستی ہسپتال سے لے گئے۔

☆ لیاقت آباد میں نامعلوم افراد کی فائرنگ سے ۱۶ سالہ اشفاق جاں بحق ہوگیا۔

☆ تیموریہ تھانے پر راکٹوں سے حملہ کیا گیا، دھماکوں کی آواز اتنی تیز تھی کہ نارتھ ناظم آباد بلاک این میں خوف و ہراس پھیل گیا اور بچے رونے لگے۔

☆ لیاقت آباد میں فائرنگ سے طاہرہ بی بی، ٦ سالہ مہرین اور عرفان زخمی ہوگئے۔

☆ جوڈیشل مجسٹریٹ محمد صابر نے اسلحہ ایکٹ میں ملوث ۱۱ سالہ مہتاب کو تیس ہزار روپے کی ضمانت پر رہا کرنے کا حکم دے دیا۔ ملزم کے وکیل رانا صفدر علی خاں نے عدالت کو بتایا کہ پولیس بچے کو رہا کرنے کے لئے رشوت طلب کررہی تھی۔ جب ان کی شکایت وزیراعلیٰ ہاؤس میں کی گئی تو ۱۱ سالہ لڑکے کے خلاف مقدمہ درج کرلیا گیا۔ اس قانون کے باوجود کہ کمسن بچے کو ہتھکڑی نہیں لگائی جاسکتی، مہتاب کو ہتھکڑی لگا کر عدالت میں پیش کیا گیا۔

☆ جیکب لائن نمبر ۲ میں واقع ٹیکنیکل اسکول میں کار پر تین مسلح نوجوان آئے اور انہوں نے اسکول میں داخل ہو کر اندھا دھند فائرنگ کی جس سے اسکول کے تین اساتذہ عبدالقیوم، سراج الدین اور شفاعت رسول، چوکیدار محمد حنیف اور طالب علم عبدالماجد زخمی ہوگئے۔

☆ ضیاالحق کالونی سے دو نامعلوم نوجوانوں کی لاشیں برآمد ہوئیں جن کے جسموں پر تشدد اور گولیوں کے نشانات تھے۔

☆ لیاقت آباد میں فائرنگ سے دو ماہ کا بچہ ذیشان بری طرح زخمی ہوگیا۔

☆ یونیورسٹی کی دیوار کے ساتھ خشک نالے سے ایک ۲۰ سالہ لڑکی کا ڈھانچہ برآمد ہوا۔ اسے بیس روز قبل قتل کردیا گیا تھا۔

یہ وہ چند خبریں ہیں جو جنگ کراچی کے گزشتہ دو ماہ کے چند شماروں سے لی گئی ہیں۔ کراچی میں چند سال سے جو خوں ریزی ہورہی ہے، اس میں اب تک لاتعداد بے گناہ، معصوم بچے قتل کیے جاچکے ہیں۔ ہمارا سوال وزیراعظم اور صوبے کے وزیراعلیٰ سے صرف اتنا ہے کہ فرعون نے تو حضرت موسیٰؑ کی پیدائش کے خوف سے بچوں کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا۔ پوچھنا یہ ہے کہ کراچی کے بچوں کو کس جرم میں قتل کیا جارہا ہے اور اس کی روک تھام کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے۔

طاہر مسعود

حمد باری تعالیٰ

مُحمّد شاہد فیروز

تو مالک ہے دونوں جہاں کا
تُو خالق ہے کون و مکان کا
ہر نعمت، سوغات ہے تیری
دن تیرا یہ رات ہے تیری
باغ پہاڑ ہیں سُندر تیرے
دریا اور سمندر تیرے
تُو نے ہی آکاش بنایا
تُو نے ہی دنیا کو سجایا
تیرے ہی سب جن و بشر ہیں
تیری قدرت سے یہ شجر ہیں
بہتی ندیا اور یہ دھارے
تیری رحمت کے گہوارے
بھُولوں کو. تُو راہ دکھائے
دُکھیوں کے دُکھ دور بھگائے
ہر سو تیرے رحم کے سائے
شاہدؔ تیرے ہی گُن گائے

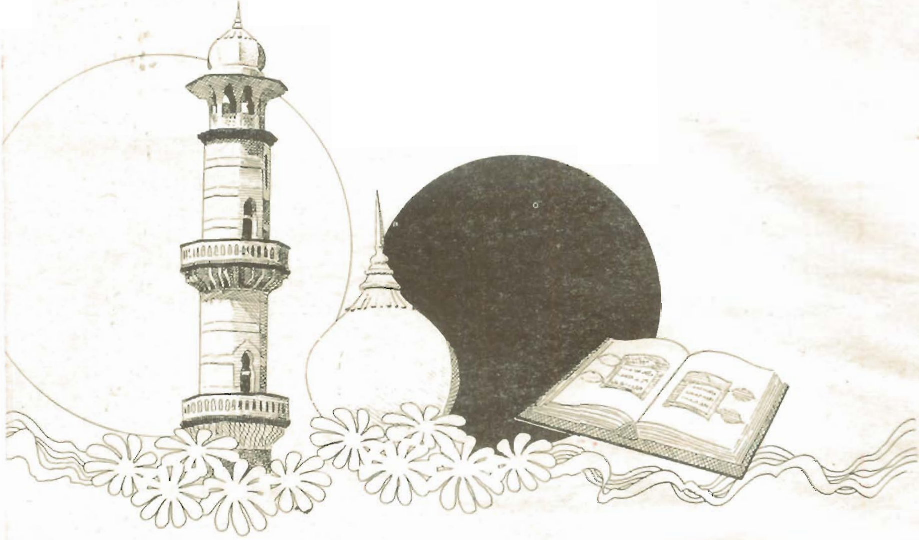

ڈاکو سے صحابی تک

شہناز بانو

"نہیں نہیں مجھ سے میرا یہ مال مت چھینو، تمہیں نہیں پتہ کہ میں نے یہ سب کتنی محنتوں اور مشقّتوں سے جمع کیا ہے۔ دیکھو مجھ بے کس اور لاچار پر رحم کرو۔"

وہ بڑھیا بُری طرح روتے ہوئے فریاد کر رہی تھی، مگر اُن لٹیروں کو اس پر کوئی رحم نہ آیا اور وہ اُس کا تمام مال واسباب لوٹ کر لے گئے۔ یہ ڈاکو بنو غفار کے وہ مظلوم لوگ تھے کہ جو بھوک اور افلاس سے تنگ آکر قافلوں پر حملے کرتے اور سب کچھ لوٹ لیتے تھے۔

اس رات ڈاکوؤں نے اس مجبور بے کس بڑھیا کو لوٹا تھا تو ان میں ایک ڈاکو کا نام ابو ذر تھا ابو ذر اس رات بالکل بھی نہ سو سکا۔ بار بار اس مظلوم عورت کا غمزدہ چہرہ اس کے سامنے آ جاتا۔

اس دن صبح کا سورج طلوع ہوا تو ابو ذر فیصلہ کر چکا تھا کہ اب آئندہ وہ کسی مجبور اور بے

کس کو نہیں لوٹے گا، اس کی طبیعت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے لوٹ مار، رہ زنی اور قتل و غارت گری سے پوری طرح بیزار ہو چکی تھی۔

اس توبہ کے بعد طبیعت میں کچھ ایسا انقلاب آیا کہ اس نے نہ صرف برائیوں سے توبہ کر لی، بلکہ تمام جھوٹے دیوی اور دیوتاؤں سے بھی اسے بیزاری محسوس ہونے لگی۔ اب اس نے خود ہی ایک ایسے اَن دیکھے خدا کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا کہ جو واقعی تمام طاقتوں کا سرچشمہ ہو، جس کے ہاتھ میں اس فانی دنیا کا بناؤ اور بگاڑ ہو، اور اس نے خود ہی اس عظیم الشان خدا کی عبادت کے لئے نماز ہی کی طرح کی کوئی صورت متعین کر لی۔ وہ جہاں ہوتا جس طرف بھی ہوتا وہیں رخ کر کے اپنے خدا کی عبادت میں لگ جاتا۔

یہ شخص جو اپنے سچے اور حقیقی رب اور معبود کی تلاش میں تھا ایک بہت ہی جلیل القدر صحابی ''حضرت ابو ذر غفاریؓ'' تھے۔

حضرت ابو ذرؓ اپنے بارے میں خود ہی بتاتے ہیں کہ قبل از اسلام ''جب میں نماز کے لئے کھڑا ہوتا تو کھڑا ہی رہتا یہاں تک کہ صبح کاذب نمودار ہو جاتی، اس وقت میں اپنے آپ کو زمین پر ڈال دیتا اور اسی طرح پڑا رہتا جیسے کوئی کپڑا پڑا ہو، یہاں تک کہ مجھ پر دھوپ چھا جاتی۔

حضرت ابو ذرؓ ہر وقت ایک ہی کلمہ دھراتے رہتے تھے۔ ''لاالہ الااللہ'' ان کے قبیلے کے لوگ وارفتگی میں ان کو یہ کلمہ پڑھتے سنتے تو آپس میں کہتے کہ ابو ذر تو پاگل ہو گیا ہے۔

یہ وہی زمانہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اسلام کی پہلی وحی نازل ہو چکی تھی اور ۴ اشخاص دائرہ اسلام میں داخل ہو چکے تھے، مگر حضرت ابوذر کو اسلام کے آنے کی خبر نہیں تھی۔

ایک مرتبہ قبیلہ بنو غفار کا ایک شخص مکہ آیا، اور اس نے وہاں اسلام کے بارے میں سنا تو واپس آکر حضرت ابو ذر کو اس کا حال سنایا۔ وہ بولا......

''اے ابو ذر! میں نے مکہ میں ایک ایسا شخص دیکھا ہے جو تمہاری ہی طرح کا کلمہ پڑھتا ہے، اور لوگوں کو ان کے آبائی خداؤں سے باز رہنے کے لئے کہتا ہے، اس کا کہنا ہے کہ الہ صرف اللہ ہے جو واحد و یکتا ہے۔''

اس شخص کے منہ سے ان سننا تھا کہ ابو ذرؓ بیتاب ہو گئے۔ وہ خود کسی رہنما اور رہبر کی تلاش میں تھے، اب جو اپنے علاوہ کسی اور کی یہ کیفیت سنی تو فوراً اپنے بھائی کے پاس آئے جو بہت دانا اور عقلمند تھے اور بڑے نامی گرامی شاعر بھی تھے۔ حضرت ابو ذرؓ نے ان کو فوراً مکہ اس شخص کی خبر لانے کے لئے بھیجا جو خدائے واحد کی طرف لوگوں کو بلاتا ہے۔

ان کے بھائی انیس مکہ گئے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مل کر آئے۔

حضرت ابو ذرؓ نے اپنے بھائی سے پوچھا کہ تم نے اس توحید کے داعی کو کیسا پایا؟ ان کے بھائی نے جواب دیا

''لوگ اسے کاہن، جادوگر اور شاعر اور نہ

جانے کیا کیا کہتے ہیں لیکن خدا کی قسم میں نے اس کو ان تمام چیزوں سے یکسر مختلف پایا ہے۔ وہ تو محض لوگوں کو برائی سے روکتا ہے اور نیکی کا حکم دیتا ہے۔

مگر اس مختصر سی بات سے حضرت ابو ذرؓ کی تسلی نہ ہو سکی اور خود تمام باتوں کی آگہی کے لئے وہ خود مکہ روانہ ہو گئے۔

مکہ پہنچ کر انہوں نے کسی سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پوچھنا مناسب نہ سمجھا اور ادھر ادھر گھوم کر حالات کا جائزہ لیتے رہے۔ کہ ایک دن حضرت علی المرتضٰی سے ملاقات ہوتی تو حضرت علیؓ نے حضرت ابو ذرؓ سے دریافت کیا۔

کہ میں آپ کو کئی دن سے یہاں دیکھ رہا ہوں لگتا ہے آپ کو کسی کی تلاش ہے، مجھے بتائیے شاید میں آپ کی کچھ مدد کر سکوں۔

حضرت ابو ذرؓ نے پہلے تو ان سے زبان بندی کا وعدہ لیا اور پھر اپنا تمام حال کہہ سنایا۔ حضرت ابو ذرؓ کے منہ سے حق کی تلاش کی جستجو کی باتیں سن کر حضرت علی خوشی سے نہال ہو گئے اور فرمایا۔

"تم نے تو ہدایت کا راستہ پالیا۔ تم جن کی تلاش میں آئے ہو بے شک وہ اللہ کے سچے رسولؐ ہیں یہ سن کر حضرت ابو ذر غفاریؓ پر رقت طاری ہو گئی۔ بیتاب ہو کر فوراً حضرت علی المرتضٰی کے ہمراہ خدمت اقدس میں حاضر ہوئے، اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ انور پر نگاہ پڑی تو ان کے دل نے گواہی دی۔ کہ بے شک آپؐ ہی اللہ کے سچے رسول ہیں۔ بے تابانہ عرض کی۔

"اے اللہ کے رسول مجھے اس دعوت حق کی تفصیل عنایت فرمائیے۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے مدلل انداز میں دین اسلام کی تفصیلات بیان کیں۔ حضرت ابو ذر غفاریؓ فوراً ایمان لے آئے، بڑے پُرجوش انداز میں کلمہ شہادت ادا کیا اور اسلام کے پانچویں رکن کی حیثیت سے دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔

کچھ دنوں کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو ذر غفاریؓ سے ارشاد فرمایا۔

"اے ابو ذر اب تم اپنے قبیلے میں واپس جاؤ اور وہاں لوگوں کو دعوت حق پہنچاؤ۔ جب تمہیں اس دعوت حق کے آشکار ہونے کی اطلاع ملے تو پھر واپس آجانا۔ فی الحال تم بھی مکہ میں اپنا اسلام قبول کرنا پوشیدہ رکھو۔"

مگر حضرت ابو ذر غفاریؓ کا دل تو جوش ایمانی سے پوری طرح منور تھا، نہایت پرجوش اور جذباتی ہو کر کہا۔

"یا رسول اللہ! آپ اجازت دیجئے میں مکہ میں اپنے قبول اسلام کا اعلان کر کے جاؤں گا آپ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو ذر کا یہ جوش و جذبہ دیکھا تو خاموش ہو گئے۔ حضرت ابو ذر غفاریؓ سیدھے حرم کعبہ میں تشریف لے گئے، اور مشرکین کے جم غفیر میں اعلان کیا۔"

"لوگو! خدائے واحد کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے سچے رسول ہیں۔"

حضرت ابو ذر غفاریؓ کے منہ سے یہ سچے کلمات جب کفار اور مشرکین نے سنے تو وہ نہایت چراغ پا ہوئے اور ان کو اس قدر مارا کہ حضرت ابو ذر غفاریؓ لہو لہان ہو گئے کفار اور مشرکین کے ہاتھوں اتنی شدید ایذا اٹھانے کے باوجود بھی حضرت ابو ذر غفاریؓ پیچھے نہ ہٹے اور دوسرے ہی دن یہ اسلام کے متوالے پھر حرم کعبہ میں پہنچ گئے، اور لوگوں کو دعوت توحید دینے لگے۔ اور گزشتہ روز کی طرح آج بھی کفار و مشرکین نے ان کے ساتھ وہی سلوک کیا۔

"اتنے میں حضرت ابن عباس بن عبدالمطلب (جو ابھی اسلام نہیں لائے تھے اور صرف انسانی ہمدردی کی بنیاد پر) وہاں پہنچ گئے اور انہوں نے حضرت ابو ذر غفاریؓ کو مشرکین سے یہ کہہ کر چھڑوایا۔

"یہ قبیلہ بنو غفار سے تعلق رکھتے ہیں جو نہایت جھگڑالو اور جنگجو لوگ ہیں۔ آج اگر تم نے ان کو مار دیا، تو بنو غفار کے لوگ تمہارا کوئی بھی تجارتی قافلہ تمہاری منزل مقصود تک نہیں پہنچنے دیں گے۔ بہتر یہی ہے کہ انہیں مزید تنگ نہ کرو اور آزاد کر دو۔" تب مشرکین نے خوف کی وجہ سے ان کو چھوڑ دیا۔

بے باکانہ اعلان حق کے بعد حضرت ابو ذر غفاریؓ نے اپنے قبیلے کی جانب واپسی کی راہ لی اور وہاں پہنچ کر سب سے پہلے اپنی والدہ اور اپنے بھائیوں کو اسلام کی دعوت پیش کی جو کہ انہوں نے بغیر کسی پس و پیش کے قبول کر لی۔ اس کے بعد انہوں نے رفتہ رفتہ اپنے قبیلے والوں میں اسلام پھیلانا شروع کیا، اور اس طرح حضرت ابو ذرؓ کی تبلیغ سے تقریباً ان کا آدھا قبیلہ ایمان لے آیا۔

حضرت ابو ذر غفاریؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بے حد محبت بلکہ عشق فرماتے تھے، ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی۔

"یا رسول اللہ! ایک شخص ایسا ہے جو بعض ہستیوں سے بہت محبت رکھتا ہے مگر ان کے اعمال کو اپنانے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اس کے متعلق کیا ارشاد ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

"وہ شخص جن کے ساتھ محبت رکھتا ہے، انہی کے ساتھ ہے۔"

حضرت ابو ذرؓ نے عرض کیا۔

"یا رسول اللہ میں تو صرف آپ سے اور اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتا ہوں۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم یقیناً اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ ہو۔"

حضرت ابو ذر غفاریؓ کی سیرت کا سب سے نمایاں پہلو زہد و تقویٰ اور صبر و قناعت ہے، اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا یہ عالم

تھا کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ”مسیح الاسلام“ کا لقب عطا فرمایا۔

آقائے نامدار سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم بھی حضرت ابو ذرؓ سے بے پناہ شفقت اور محبت فرماتے تھے۔

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر مرض الموت طاری ہوا تو حضرت ابو ذرؓ کو بلوایا۔ اور جب حضرت ابو ذر بارگاہ نبویؐ میں پہنچے تو انتہائی عقیدت و محبت سے والہانہ انداز میں حضور پر جھکے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا ہاتھ اپنے جسم اطہر کے ساتھ چمٹا لیا۔

جواباً حضرت ابو ذرؓ پر بھی وارفتگی طاری ہو گئی۔

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا سے پردہ فرمالیا تو حضرت ابو ذرؓ کا دل دنیا سے اچاٹ ہو گیا، اور حضور کے وصال کے بعد جب بھی حضرت ابو ذر کو آپؐ کا خیال آتا یا آپؐ کا ذکر ہوتا تو حضرت ابو ذرؓ کی آنکھوں سے اشکوں کا سیل رواں ہو جاتا اور شدت جذبات کے ساتھ آواز سینے میں گھٹ کر رہ جاتی۔

اب حضرت ابو ذرؓ مدینہ کو چھوڑ کر شام میں جا بسے، جناب کے زہد و تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ جو کچھ بھی ہاتھ میں آتا، سب راہ خدا میں لٹا دیتے۔ آپ فطرتاً بہت سادہ اور فقرانہ صفات کے مالک تھے، ان کی زاہدانہ اور متوکلانہ زندگی کو دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ابو ذرؓ میں عیسیٰؑ بن مریمؑ جیسا زہد ہے۔

> ### حضرت عثمانؓ نے فرمایا
>
> ○ جو شخص خدا سے محبت رکھتا ہے وہ تنہائی سے محبت رکھتا ہے۔
>
> ○ دانا شخص وہ ہے جو وقت دیکھ کر کام کرتا ہے۔
>
> ○ اگر تیری آنکھیں روشن ہیں تو ہر روز روز محشر ہے۔
>
> ○ لوگوں کو آزمانے پر انہیں زہریلے جانوروں سے کم نہ پائے گا۔
>
> مرسلہ: عرشیان اصغر(؟)

۳۱ھ یا ۳۲ھ میں جب حضرت ابو ذر مرض الموت میں مبتلا ہو گئے اور جب ان پر نزاع کی کیفیت طاری ہوئی تو ان کی اہلیہ ان کو اس حالت میں مبتلا دیکھ کر رونے لگیں تو حضرت ابو ذر نے ان سے پوچھا۔

”روتی کیوں ہو۔؟“

ان کی رفیق حیات نے جواب دیا کہ اس ویرانے میں آپ ہم سے رخصت ہو رہے ہیں ہم تو بالکل بے یارومددگار ہیں، نہ تو میرے پاس اتنا کپڑا ہے کہ آپ کو کفن دے سکوں اور نہ میرے جسم و بازوؤں میں اتنی طاقت ہے کہ آپ کی آخری آرام گاہ تیار کر سکوں۔

حضرت ابو ذرؓ نے فرمایا۔

سنو! ایک دن ہم چند لوگ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ تم میں سے ایک شخص صحرا میں جاں بحق ہو گا اور اس کے جنازے

میں مسلمانوں کی ایک جماعت باہر سے آکر شرکت کرے گی، اس وقت جتنے بھی لوگ موجود تھے۔ وہ سب وفات پا چکے ہیں صرف ایک میں ہی باقی بچا ہوں، تم باہر جا کر دیکھو، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق مسلمانوں کی کوئی جماعت ضرور آئی ہوگی۔

حضرت ابو ذر غفاریؓ کی زوجہ محترمہ باہر آگئیں اور گھر کے قریبی ٹیلے پر کھڑی ہو کر متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔

یکایک دور سے آتے ہوئے کچھ گھڑ سوار ان کی نگاہوں کی گرفت میں آگئے۔ جب وہ نزدیک آ کر ٹھہر گئے، تو حضرت ابو ذر غفاریؓ کی زوجہ محترمہ نے ان سے کہا۔

بھائیو! قریب ہی ایک مسلمان اپنے سفر آخرت کی تیاری کر رہا ہے۔ اگر تم لوگ کچھ مہربانی کرو، تو اس کے اس سفر کی تیاری میں میرا ہاتھ بٹا دو۔"

ان لوگوں نے دریافت کیا، کہ وہ شخص کون ہے ؟

ان کی زوجہ محترمہ نے جواب دیا، ابو ذرؓ!

حضرت ابو ذرؓ کا نام سنتے ہی وہ سب بیتاب ہو گئے، اور بے ساختہ ان کے منہ سے نکلا، ہمارے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔

ادھر حضرت ابو ذرؓ کی مہمان نوازی ملاحظہ ہو،

وہ اپنی بیٹی سے فرما رہے ہیں میری بچی ایک بکری ذبح کر کے اس کا سالن تیار کرو جو مہمان میری تجہیز و تکفین کریں، ان کو خدا کی قسم دے کر کھانا کھلانا اور یہ کہنا کہ یہ ابو ذرؓ کی خواہش تھی۔

جب وہ تمام اشخاص حضرت ابو ذرؓ کے خیمے میں داخل ہوئے، تو حضرت ابو ذرؓ نے ان کی طرف منہ کر کے فرمایا،

تم میں سے ایسا شخص مجھے کفنائے اور دفنائے، جو کبھی حکومت کے کسی عہدے پر فائز نہ رہا ہو۔

ان سب اشخاص میں سے صرف ایک انصاری نوجوان ایسا تھا جو کبھی بھی حکومت کے کسی بھی عہدے پر فائز نہ ہوا تھا۔

وہ نوجوان آگے بڑھا اور کہا کہ میں ہوں وہ شخص جس نے کبھی بھی حکومت وقت کے ساتھ ان کے کاموں میں شامل نہیں ہوا ہوں۔ اس کے علاوہ اس وقت میری ماں کے ہاتھ کے بنے ہوئے دو کپڑے ہیں، اگر آپ پسند کریں تو میں انہی کا کفن آپ کو دے دوں۔

حضرت ابو ذر غفاریؓ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اور پھر ان سب کے سامنے ہی کلمہ شہادت ادا کیا۔ اور اپنی جان جاں آفریں کے سپرد کر دی۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابو ذر غفاریؓ کی سیرت کے تمام پہلو، ان کا عشق حقیقی اور عشق رسول، ان کا زہد و تقویٰ خشیت الٰہی، سب کچھ ہمارے لئے مشعل راہ ہے۔

میم سے منہ

آصف وقار آصف

منہ ہمارے جسم کا سب سے افضل حصہ ہے جسے "چہرہ" بھی کہتے ہیں۔ منہ کے اوپر چند ضروری "اشیا" بھی آراستہ ہیں جن میں دو عدد آنکھیں ' ایک عدد ناک اور ایک عدد "منہ" ۔ جی ہاں "منہ" جس میں زبان بھی پائی جاتی ہے جیسے بقول شاعر....

ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

بعض لوگ زبان کا بہت غلط استعمال کرتے ہیں اور ہر ایک بات کا "منہ توڑ" جواب دیتے ہیں۔ اور بعض "منہ ہی منہ میں" بڑبڑا کر رہ جاتے ہیں۔ کچھ لوگ "منہ زبانی محبت" کے قائل ہوتے ہیں اور پھر پیٹھ پیچھے برائیاں کرتے ہیں جنہیں سن کر سب ہی "منہ بناتے ہیں"۔ بعض افراد اتنے "منہ زور" ہوتے ہیں کہ مدمقابل کو "منہ کی کھانا" پڑتی ہے۔ انہی کے

بارے میں کہا گیا ہے کہ "یہ منہ اور مسور کی دال"۔ بعض اشخاص خوامخواہ ہر جگہ "منہ مارتے" رہتے ہیں اور اکثر انہیں "اپنا سا منہ لے کر" رہ جانا پڑتا ہے۔ منہ سے بولتے ہوئے ہمیشہ پہلے تولو پھر بولو۔ کیونکہ منہ سے نکلی بات واپس نہیں آتی۔ "منہ سے نکلی کوٹھوں چڑھی"۔ ہمیشہ منہ سے سچ بات ہی نکالنی چاہئے۔ سچ تو کڑوا ہوتا ہے جسے سن کر لوگ عجیب عجیب "منہ بنانے" لگتے ہیں۔

منہ پر عینک بھی لگائی جاتی ہے۔ کمزور بینائی والوں کی پہچان "عینک" ہے۔ جبکہ لڑکوں کی پہچان منہ پر سجی "مونچھیں" ہیں جو ناک سے ذرا نیچے پائی جاتی ہیں۔ عورتوں کے منہ کی پہچان "میک اپ" اور "لپ اسٹک" ہے۔ عورتیں تو منہ کو باقاعدہ "پینٹ" کرتی ہیں رنگوں سے۔ جبکہ بوڑھوں کی پہچان ان کے منہ پر پڑی "جھریاں" ہیں۔ ضعیفی کا ٹریڈ مارک"۔ بچوں کے منہ پر ہنستی کھیلتی "مسکراہٹ" ہی ان کی پہچان ہے۔ آنکھوں میں ذہانت اور منہ پر بکھری بے نیاز مسکراہٹ انہیں سب سے بے نیاز کر دیتی ہے، سب سے جدا۔

منہ پر "نقاب" بھی پہنے جاتے ہیں۔ بڑوں کو چاہئے کہ وہ بچوں سے سبق سیکھتے ہوئے تصنع اور بناوٹ کے تمام نقاب اپنے منہ سے اتار دیں اور بچوں جیسی شگفتہ اور معصوم مسکراہٹ اپنے منہ پر سجالیں۔ پُر خلوص مسکراہٹ کا "نقاب" منہ کو پُر رونق بناتا ہے۔ ہر وقت "منہ نہ بسوریں" بلکہ کسی کی خاطر مسکرائیں بھی کیونکہ "کسی کے لئے منہ پر مسکراہٹ لانا بھی ایک نیکی ہے۔"

آنکھ مچولی کا تحفہ

ماہ مئی کی قرعہ اندازی میں "آنکھ مچولی کا تحفہ" حاصل کرنے والے ساتھیوں کے نام:

۱۔ معوذ احمد، پشاور ۔ ۲۔ غلام مرتضیٰ علی، کھاریاں ۔ ۳۔ محمد رضوان الزمان، عمرکوٹ ۔ ۴۔ طاہر امتیاز، پتوکی ۔ ۵۔ تابندہ رحمٰن، کراچی ۔ ۶۔ فرحان خان، اٹک ۔ ۷۔ محمد تنویر، چکوال ۔ ۸۔ شوکت علی، خوشاب ۔ ۹۔ امجد محمود مغل، کوٹلی ۱۰۔ عبدالغفار، کراچی ۔

محنت، لوہا، بجلی، تار مل کر بن گئے ڈائنوسار

سلمان خان

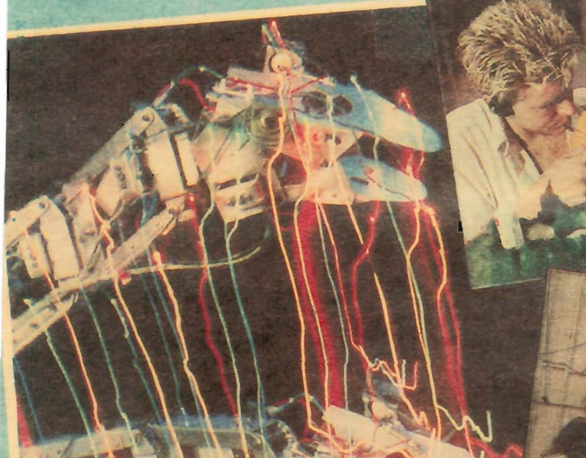

جراسک پارک کے ڈائنوسار تیاری کے مختلف مراحل میں...

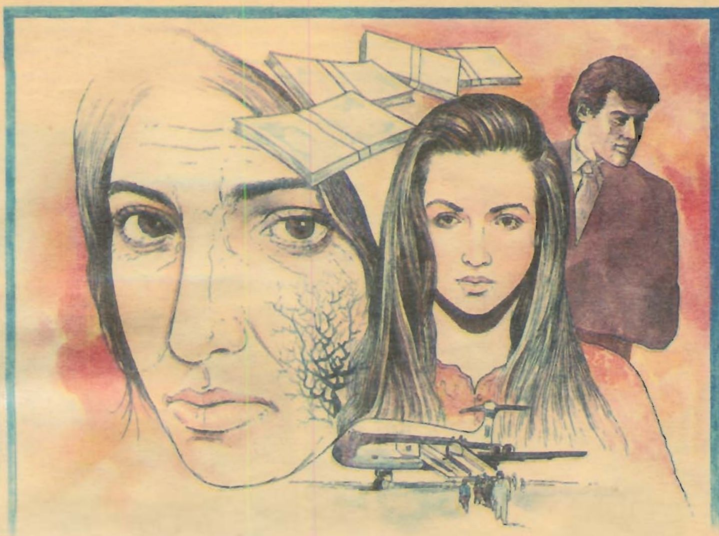

ایک تھی اماں

فصیح باری خان

بی بی سی لندن کی اردو نشریات کے لئے بابا اپنی ریکارڈنگ مکمل کروا کے گھر روانہ ہو گئے اور میں باہر لان میں پاؤں پسارے بیٹھی ہی تھی کہ زبیری صاحب اوپری بلڈنگ کی گیلری میں آکر چلائے
"نائلہ فون ہے تمہارے بابا کا پاکستان سے۔"
میں بدحواسی میں اٹھ کر اوپر بھاگی۔ فون اٹھایا تو دوسری طرف مجو ماموں تھے۔ وہ اپنی نشے میں ٹوٹتی ہوئی آواز کو مزید توڑ کر بولے "کون --- کون ہے ---
"کیا بات ہے مجو ماموں، میں بٹو ہوں"--- میری آواز لرز رہی تھی
"بٹو بیٹا --- بٹو --- تو سن رہی ہے ناں بٹو --- بٹو بیٹا تیری اماں نہیں رہیں --- تیری اماں۔"
وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔
"اچھا"--- میں نے ریسیور کو مضبوطی سے تھام لیا۔ میرا جسم برف کا مجسمہ بن گیا مگر شاید میرے

لہجے میں بالکل بھی حیرت نہیں تھی۔

"تین منٹ کی کال ہے بیٹا -- ابا کو بتا دینا۔ ہاں اور صبر کرنا بٹو بیٹا۔"

انہوں نے رسیور رکھ دیا

"کیا ہوا نائلہ ---" زبیری صاحب فائل ایک طرف رکھ کر بولے

"اماں مر گئیں زبیری انکل۔"

"اوہ --- مجھے --- وہ شاید کچھ بولنا چاہ رہے تھے۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں منع کردیا "بچپن کی باسی یادوں کی اہمیت کچھ بھی نہیں ہوتی زبیری انکل۔"

"تم گھر جاؤ --- آرام کرو۔"

"میں بالکل نارمل ہوں --- مجھے کل کے پلے کا اسکرپٹ چاہئے۔"

"اس وقت ---" ان کی پیشانی پر لکھی حیرت کا مفہوم مجھے معلوم تھا

"جی ہاں اسی وقت --- مجھے یاد کرتا ہے بھئی یوں بھی وارثی صاحب کا اسکرپٹ کم از کم دس بار پڑھنے کے بعد سمجھ میں آتا ہے۔"

انہوں نے مجھے خاموشی سے اسکرپٹ تھما دیا اور مجھے غور سے دیکھنے لگے۔

دروازے سے نکلتے نکلتے میں ہلکے سے بولی "آپ نہیں سمجھ پائیں گے۔ کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا۔ کوئی بھی نہیں ---"

گھر پہنچی تو بابا نیوز دیکھ رہے تھے۔

رابعہ ممی کچن میں کافی پھینٹ رہی تھیں۔

میرے قدموں کی آہٹ پر انہوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا "بٹو تم منہ ہاتھ دھو کر فریش ہو جاؤ۔ میں کافی لاتی ہوں --- یہ سردی تو کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی ہے۔"

میں نے ہاتھوں سے دستانے اتار کر ٹیبل پر رکھ دیئے۔ پھر کرسی پر بیٹھ کر موزے اتارنے لگی۔

بابا اسکرین پر نظر جما کر بولے : "سب کے سب کرپٹ ہیں۔"

انہوں نے ریموٹ کا بٹن دبا کر چینل تبدیل کردیا۔

میں کرسی سے ٹیک لگائے خاموش بیٹھ گئی۔

کمرے میں سب کے ہوتے ہوئے بھی ایسا لگ رہا ہے کہ شاید کوئی نہیں ہے۔

بابا نے خاموشی توڑی "Rubbish --- اس مووی کو اکیڈمی ایوارڈ ملا ہے۔ یہ تو بالکل ہی کچرا فلم ہے۔ تم نے دیکھی تھی نا بٹو یہ فلم؟"

"جی --- جی ہاں۔"

"تمہاری ریکارڈنگ کیسی رہی؟"

"بس ٹھیک رہی ---

"زبیری تمہاری بڑی تعریف کر رہا تھا۔ کہہ رہا تھا تمہارا اردو کا Pronaunciation بہت اچھا ہے۔"

"بابا ---"

"ہوں ---" ان کی نظریں بدستور ٹی وی کی

پر مجھے کسی بات کی پروا نہیں تھی اور نہ مجھے اماں کے ہوتے ہوئے کسی اور ساتھی کی مزید ضرورت تھی۔

ایک رات میں اماں سے بادشاہ سلامت کی کہانی سن رہی تھی کہ مجھے بابا یاد آگئے۔

"بابا کب لوٹیں گے اماں؟"

"وہ اب کبھی نہیں لوٹیں گے بٹو۔"

"کیوں اماں ...." میں اماں کی ساڑھی کے پلو سے کھیلتے ہوئے بولی۔

"اس لئے ..... اس لئے بٹو کہ انہوں نے لندن میں دوسری شادی کرلی ہے۔"

"اچھا ہے نہ آئیں۔ مجھے تو ویسے ہی صرف اماں اچھی لگتی ہے......" میں اماں سے لپٹ گئی اس وقت اماں کے چہرے پر ایک آسودہ مسکراہٹ تھی، سب کچھ پالینے والی فخریہ مسکراہٹ۔

گزر اوقات کے لئے اماں نے پاپڑ اور بڑیاں بنانی شروع کردی تھیں۔ سارا سارا دن اماں بس اسی میں الجھی رہتی۔ میں کچھ کام کرنے کے لئے ضد کرتی تو وہ مجھے پنکھے کے پاس بٹھادیتیں۔ "پاگل آنگن میں اتنی دھوپ ہے۔ سیاہ پڑجائے گی تو میری طرح....." تھوڑی دیر وہ خاموشی سے مجھے تکتیں اور پھر بڑبڑاتیں "اچھا ہوا تو اپنے باپ پر گئی ہے.... ویسا ہی گلابی رنگ .... بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں .... شکر ہے پروردگار کا کہ میری بدصورتی کو میری اولاد کا مقدر نہیں بنایا۔"

اماں کام کرکے کمزور ہوگئی تھی۔ تھوڑا بہت جو کبھی زیادہ کمالیتی تو وہ مجو ماموں اپنے نشے کے لئے لے اڑتا۔

سردیوں کی لمبی راتوں میں جب بار بار میری نیند ٹوٹتی تو میں دیکھتی اماں دھندلی سی روشنی میں پڑوس کی عورتوں کے کپڑوں پر کڑھائی کررہی ہوتیں۔

کبھی کبھی میں سوچتی کیسی ہے یہ اماں صرف دینا ہی جانتی ہے۔ اپنی محبتیں وہ اتنی فراخدلی سے مجھ پر نچھاور کرتی ہے جیسے اس کے باپ دادا محبتوں کے انبار چھوڑ کر گئے ہوں۔ یہ کیوں ایسی ہے یا شاید دنیا کی ساری مائیں ہی ایسی ہوتی ہیں۔

ایک صبح جب میں سو کر اٹھی تو اماں کو بڑا پریشان دیکھا "آج تو گیارہ برس کی ہوگئی ہے .... تیرے ساتھ کی لڑکیاں تیسرے درجے میں پڑھ رہی ہیں اور تو.... میں کیا کروں کچھ تھوڑا بہت جو ہاتھ آتا ہے وہ خبیث مجو لے جاتا ہے۔"

"مجھے نہیں پڑھنا وڑھنا".. میں نے جماہی لی۔

"دماغ درست ہیں تیرے..... ادھر آ میرے ساتھ ......" اماں مجھے سونے والے کمرے میں لے گئی اور مسہری کے نیچے سے ٹین کا بکس نکالا ۔ "یہ تیرے بابا کی کتابیں ہیں ۔ میں روز انہیں جھاڑ پونچھ کر صاف کرتی ہوں۔ انہیں تونے ہی پڑھنا ہے بٹو... ہے ناں بٹو...." انہوں نے مڑ کر میری طرف دیکھا اماں کی آنکھوں میں ننھے

ستارے چمک رہے تھے۔ میں نے اثبات میں زور سے سرہلایا اور اماں نے میرے چہرے کے اتنے بوسے لئے کہ میں لال بھبوکا ہوگئی۔

اب اماں کو ایک نیا خبط سوار ہوگیا کہ مجھے اچھے اسکول میں داخل کروانا ہے۔ اماں کی آنکھوں کے گرد حلقے بڑھتے ہی جارہے تھے۔ اب تو اماں کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو دیکھنے کے لئے ٹارچ کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی۔ میں نے تو ایک بار اماں سے کہہ بھی دیا۔ اماں ہنس پڑیں پھر لاڈ سے میرے بال بگاڑ کر بولیں "تیری آنکھوں کی روشنی اور بڑھے مجھ بدصورت بڑھیا کو اب کون دیکھے گا۔"

اتنی محنت کے بعد بھی اماں کا خواب پورا ہوتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایک دن شام کو اماں میرے سر میں تیل ڈال کر مالش کررہی تھی کہ دروازہ کھلا۔

وہ دونوں کوئی بھی تھے مگر زمینی مخلوق نہیں لگ رہے تھے۔ ایسے خوبصورت نکھرے نکھرے اور صاف چہرے میں نے پہلے کب دیکھے تھے۔ وہ شخص جس کی شکل مجھ سے ملتی جلتی تھی۔ آگے بڑھا "تم نائلہ ہونا۔ نائلہ میں تمہارا بابا ہوں۔" وہ شاید مجھے بازوؤں میں بھرنا چاہتا تھا۔ میں ڈر کے مارے اماں سے چمٹ گئی۔

وہ اماں کے پاس آیا "یہ رابعہ ہیں... نائلہ اپنی چھوٹی امی سے ملو...."

میں نے چور نگاہوں سے اماں کی طرف دیکھا۔ وہ ہاتھوں میں لگے تیل کو ساڑھی کے میلے پلو سے چپکے چپکے صاف کررہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد اماں اٹھیں اور اندر سے کرسیاں لے کر آئیں۔ باربار کپڑے رگڑ رگڑ کر کرسیوں کو صاف کرنے کے بعد انہوں نے رابعہ ممی کا ہاتھ پکڑ کر انہیں کرسی پر بٹھایا۔

"آپ بھی بیٹھ جائیے ...." انہوں نے بابا سے آہستگی سے کہا۔

"میں چائے لاتی ہوں....."

"نہیں نہیں رہنے دو...." بابا فوراً بولے۔

"یہ کیا بات ہوئی ..... گھر آئے ہوئے مہمان کی خاطر تواضع نہ ہو کیا ایسا ممکن ہے۔"

اماں باورچی خانے میں گھس گئیں۔

"نائلہ یہاں آؤ" رابعہ ممی نے مجھے پاس بلایا۔ جانے ان کی آواز میں کیا سحر تھا کہ میں خود بخود ان تک پہنچ گئی۔

"کتنی پیاری ہے ناں...." انہوں نے میرے گال کو نزاکت سے چھو کر بابا سے کہا۔

"بالکل ... مگر اب اس کی رنگت خاصی جھلس گئی ہے ... تم اسے اس وقت دیکھتیں جب یہ چھوٹی تھی بالکل انار کی طرح سرخ تھی...."

"کس کلاس میں پڑھتی ہو بیٹا۔" رابعہ ممی میری

چوڑیوں سے کھیل رہی تھیں۔
"جی ... میں نے ابھی اسکول میں داخلہ نہیں لیا۔"
رابعہ ممی اور بابا میرے جواب پر ایک دوسرے کو کافی دیر تک تکتے رہے۔
اماں یکدم باورچی خانے سے نکلیں اور آنگن میں بیٹھی چڑیوں کو زور زور سے چلا کر بھگانے لگیں جو مونگ کی دال کو اپنی چونچ میں بھر کر اڑ رہی تھیں۔
بابا نے ان کے اس عمل پر ناگواری سے منہ بنایا۔
رابعہ ممی لاتعلق بنی بیٹھی رہیں۔
اماں کھسیا کہ بولیں "بڑی ندیدی ہوتی ہیں چڑیائیں .... گرمی لگ رہی ہو تو آپ لوگ اندر بیٹھ جائیں۔"
"نہیں نہیں ہم یہیں ٹھیک ہیں۔" بابا کا لہجہ حکمیہ تھا۔
اماں چائے لے کر آئیں ... میں نے غور سے کپوں کی طرف دیکھا۔ یہ کپ اماں نے بڑے سنبھال کر رکھے تھے۔ کتنے ہی مہمان آئے مگر اماں نے یہ کپ نہیں نکالے۔ سب کو ٹوٹے ہوئے مگوں میں ہی چائے ملتی۔ میں سوچتی تھی کہ جانے کون خوش نصیب ہوں گے جن کے لئے ان کو لے کر رکھا گیا ہے۔ اور آج وہ خوش نصیب میرے سامنے تھے۔
رابعہ ممی بڑے ٹھہر ٹھہر کر چائے کے سپ لے رہی تھیں۔ بابا نے دو ایک گھونٹ لے کر چائے ایک طرف رکھ دی اور اماں سے سختی سے بولے
"چائے بنانی تمہیں ابھی تک نہیں آئی...."
اماں کچھ نہیں بولیں بس سر جھکائے دانتوں سے ناخن کترتی رہیں۔
"نائلہ تم اندر جاؤ.... مجھے تمہاری اماں سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔"
میں اٹھ کر اندر چلی گئی۔
کتنی ہی دیر میں اندر ہی رہی اور پھر وہیں پڑے پڑے سو گئی۔ صبح اٹھی تو اماں میرے ساتھ ہی سو رہی تھیں ان کا پورا بدن پسینے میں شرابور تھا۔
"اماں۔۔۔ اماں......"
"ہاں...." وہ نیند میں بڑبڑائیں
"اٹھو اماں دن چڑھ آیا ہے۔"
"اچھا....." وہ فوراً" اٹھ بیٹھیں۔
"رات بابا کب گئے تھے۔۔؟"
"کون...؟"
"بابا"
"ہاں۔۔آں ۔۔۔ چلے گئے تھے۔۔بٹو..."
"جی اماں...."
"کچھ نہیں کچھ بھی نہیں۔" وہ دوبارہ چادر لپیٹ کر سو گئیں۔
بابا کے جانے کے بعد اماں کے رویئے میں بڑی

تبدیلی آگئی تھی۔ اب وہ ہر بات پر چڑچڑا پن کرنے لگی تھیں۔ اس دن جب انہوں نے مجھے کھانے پر ٹوکا تو مجھے بہت برا لگا۔ میں ایک کونے میں جاکر بیٹھ گئی مگر انہوں نے میری طرف دیکھا بھی نہیں۔

وہ مجھے سنانے کے لئے زور سے بولیں " تھک گئی ہوں میں بوجھ اٹھاتے اٹھاتے ۔ اب اور سکت نہیں مجھ میں ۔ ۔ ۔ باپ تو عیش کررہا ہے اور بیٹی جونک کی طرح میرا خون پی پی کر سانڈ بن رہی ہے۔ کتنا کماؤں کتنا ٹھنساؤں پیٹ ہے کہ بھرتا ہی نہیں...."

میں گھٹنوں میں منہ دے کر دھیرے دھیرے سسکنے لگی۔ میں کوئی بچی تو نہیں تھی۔ گیارہ سال کی سمجھدار لڑکی ماں کے سب بھید جان جاتی ہے۔ مجھے علم تھا کہ اماں چاہتی ہیں کہ بابا جو بڑے سوٹڈ بوٹڈ اور پیسے والے آدمی ہیں اپنی آمدنی کا کچھ حصہ ان کی ہاتھ پر بھی رکھیں۔ اماں رابعہ ممی کا رکھ رکھاؤ دیکھ کر جل گئی تھیں۔ وہ سوچتی ہوں گی کہ کاش رابعہ ممی کی جگہ وہ خود ہوتیں۔ مگر کیا رابعہ ممی کی طرح پہن اوڑھ کر بھی وہ ان کی طرح بن سکتی ہیں ۔ ۔ ۔ ناممکن ۔ ۔ ان دنوں میں ہر وقت اپنی سوچوں میں گم گھتار ہنے لگی تھی۔

اس شام بابا آئے تو میرا رویہ ان کے خلاف توقع خاصا خوشگوار تھا۔ میں اماں کو جلانے کے لئے رابعہ ممی کے پاس گھسی رہی۔ انہوں نے بڑے پیار سے میرے بالوں کو کھول کر اپنے برش سے سلجھایا اور پھر بڑی نفاست سے میری چوٹی بنائی۔

" میں کچھ چیزیں لائی تھی تمہارے لئے ....."

رابعہ ممی نے بابا کو اشارہ کیا۔ بابا نے ایک بڑا سا ڈبہ اٹھا کر میری طرف بڑھادیا۔

"کیا ہے اس میں ....؟" میرے لہجے میں اشتیاق تھا۔

انسان کیسے کیسے ......

جاپان کے ایک شہنشاہ سونو کو نے اپنے خون سے کتاب لکھی تھی یہ کتاب ۱۳۵ صفحات پر مشتمل تھی۔

پولینڈ کی ملکہ کرسٹین اپریاڈرین نے اپنے ملک پر ۵۰ سال تک حکومت کی اور اس پچاس سالہ دور میں اس نے اپنے محل سے کبھی قدم باہر نہیں نکالا۔

امریکہ کے ایک شخص ڈبلیو۔ جے۔ پرامرز کی آنکھیں بیحد خوبصورت تھیں اس کی ایک آنکھ زرد جبکہ دوسری نیلی تھی۔

اٹلی کے کیوی گارنٹ کی آنکھیں الو کی طرح تھیں اسے دن میں کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا جب کہ رات کو وہ ہر چیز دیکھ سکتا تھا۔

نیو یارک کے ۳۸ سالہ پابلو سوارز کے ہاتھوں میں اتنی حدت آسکتی ہے کہ وہ اپنی ہتھیلیوں پر انڈا فرائی کر سکتا ہے۔ اس کے ہاتھ ہر وقت گرم رہتے ہیں۔ تاہم جب اسے غصہ آتا ہے تو اس کے ہاتھ بے حد گرم ہو جاتے ہیں۔

مرسلہ :۔ عبد الباسط۔ ہری پور۔

"کھول کر دیکھو....." بابا محبت سے بولے۔
میں نے بے صبری سے ڈبہ کھولا۔
"افوہ اتنی ڈھیر ساری چیزیں....."
"یہ گڑیا بیٹری سے چلتی ہے۔ Poems گاتی ہے۔ Good Morning کہتی ہے۔ اور یہ گڑیا کا کچن ہے۔ یہ ڈرائنگ روم ہے اور یہ کپڑوں کی وارڈروب......."
میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اگر ان چیزوں کو محلے کی لڑکیاں دیکھ لیں تو جل جل کر مرجائیں اور اماں.....
میں نے سر اٹھا کر دیکھا اماں بڑے غور سے گڑیا کو دیکھ رہی تھیں۔
بابا اور رابعہ ممی ہر دوسرے دن آجاتے تھے۔ تکلف کی دیوار جو میرے اور بابا کے درمیان حائل تھی اسے بابا کے دوستانہ برتاؤ نے گرا دیا۔
بابا کے ساتھ اس ٹھنڈی رات کو جب میں سمندر کے کنارے قدم سے قدم ملائے چل رہی تھی تو بابا میرے ہاتھ چوم کر بولے "میرا بیٹا میرے ساتھ لندن چلے گا۔"
"میں....."
"وہاں خوب عیش کراؤں گا اپنے بیٹے کو۔ ۔ آنکھیں کھلی رہ جائیں گی میری بٹو کی۔"
"مگر اماں....."
بابا کی پیشانی پر بل پڑ گئے "تمہاری اماں کو تم سے محبت نہیں ہے بٹو۔ ۔ وہ تم سے نفرت کرتی ہے۔"
"نہیں بابا۔ ۔ ۔ کچھ دنوں سے وہ چڑچڑی ہو گئی ہیں۔ لیکن میں جانتی ہوں انہیں مجھ سے بہت محبت ہے۔" میرے لہجے میں یقین تھا۔
"یہ کیسے کہہ سکتی ہو تم...؟"
"مجھے پتہ ہے نا بابا۔"
"بٹو...."
"جی بابا..."
"تمہاری ماں نے تمہیں بیچ دیا ہے۔ جانتی ہو پورے پچاس ہزار وصول کئے ہیں انہوں نے تمہارے....."
"نہیں .... آپ جھوٹ بول رہے ہیں....." میں ان کا ہاتھ تیزی سے چھڑا کر دوڑتی چلی گئی۔ بابا نے بڑی مشکلوں سے مجھے پکڑا۔ جب انہوں نے مجھے سینے سے لگایا تو میں ہچکیاں لے کر رو رہی تھی۔
بابا نے کہا "تمہیں یقین نہ آئے تو اپنی اماں سے پوچھ لو۔" وہ مجھے گھر کے دروازے پر چھوڑ کر چلے گئے۔
اندر گئی تو اماں لالٹین کی روشنی میں آنگن میں بیٹھی پاپڑ کی ٹکیاں بنا رہی تھیں۔
"اماں ۔ ۔ ۔"
"کیا ہے ۔ ۔ ؟" وہ رکھائی سے بولیں

"مجھے ایک بات پوچھنی ہے آپ سے ---؟"

"بولو ---"

"بابا کہتے ہیں کہ آپ نے مجھے پچاس ہزار میں انہیں بیچا ہے۔"

"ہاں تو ---" وہ کاٹ کھانے کو دوڑیں۔ "بچپن سے اب تک تجھ پر جو میں نے خرچ کیا ہے وہ دے گا تیرا باپ --- پچاس ہزار دے کر سمجھتا ہے کہ بڑا احسان کر رہا ہے مجھ پر۔"

"اماں نہیں --- --- اماں نہیں --- اماں نہیں ---" میں زمین پر گر کر زور زور سے چیخنے لگی۔

اماں مجھے غصے سے گھورتی ہوئی اندر چلی گئی۔

شام کو بابا آئے تو میں نے ان کے سینے میں منہ چھپالیا "بابا میں آپ کے ساتھ جاؤں گی۔ ابھی اسی وقت۔"

"میں تمہیں اسی ہفتے اپنے ساتھ لندن لے جاؤں گا۔" بابا نے مجھے تسلی دی۔

اور جس شام میں لندن روانہ ہو رہی تھی۔ اس شام میں آخری بار اماں سے ملی۔ وہ سر جھکائے پاپڑ کو ہاتھوں سے مسلے جا رہی تھیں۔

"میں جا رہی ہوں اماں۔"

انہوں نے نظر اٹھا کر بھی میری طرف دیکھنا مناسب نہیں سمجھا۔

"مجھے آپ سے نفرت ہے --- نفرت ہے --- میں آپ سے ملنے کبھی نہیں آؤں گی۔ کبھی نہیں۔"

جہاز کراچی ایئرپورٹ پر اتر گیا تھا۔

شہر کی ٹیڑھی میڑھی گلیاں طے کرتے ہوئے ہم اس گھر کے سامنے رک گئے۔ وہ گھر جہاں میری زندگی کی باسی اور کڑوی یادوں کا ایک ہجوم اکٹھا تھا۔

بابا نے دروازہ کھٹکھٹایا

مجو ماموں نے دروازہ کھولا --- مجھے گلے لگا کر وہ زور زور سے رونے لگے۔ "چوبیس گھنٹے بس بٹو بٹو کیے جاتی تھی ---"

چھوٹا سا آنگن اب بھی اتنا ہی پیارا تھا۔ ایک بیمار سی بڈھی مرغی کونے میں مظلوم شکل بنائے خلاؤں میں کچھ دیکھ رہی تھی۔

ندیدی چڑیائیں باسی پاپڑ اور بڑیوں پر ٹوٹی پڑی تھیں۔

"اندر آجاؤ بٹو --- اپنی اماں کو آخری مرتبہ دیکھ لو۔"

سب اندر چلے گئے

اماں نیچے لیٹی ہوئی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا کہ وہ گہری نیند سو رہی ہوں۔ ان کے چہرے پر وہی دھیمی سی مسکراہٹ تھی جو کبھی مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔

بابا دھیرے سے بولے "جاؤ --- وہاں ان کے پاس --- دیکھ لو اپنی اماں کو آخری بار۔"

"نہیں---میں نے بابا کا ہاتھ سختی سے تھام لیا۔
میری آنکھوں کے گرد سیاہ دائرے ناچنے لگے۔

"بٹو بھول جاؤ سب---جاؤ---رابعہ ممی اور بابا مجھے دھکیلتے ہوئے اماں کی طرف لے گئے اور میں منہ ہی منہ میں "نہیں---نہیں---بڑبڑاتی ہوئی اماں کے نزدیک آ گئی۔

جب میں اماں کے قریب آئی تو باقی سب لوگ میری نظروں سے دور ہو گئے۔ یوں لگا کہ یہ ساری دنیا صرف اماں اور مجھ تک محدود ہے۔

میں نے اپنا لرزتا ہوا ہاتھ دھیرے سے اماں کی سرد پیشانی پر رکھا۔

کہیں دور سے آوازوں کا ایک ہجوم میرے سر پر ٹھونگیں مارنے لگا۔

"بٹو---بٹو---بٹو---اماں کی آواز کہیں آس پاس ہی بھٹک رہی تھی۔

میں بالکل نہیں روئی۔ میرے اندر آنسوؤں کا سمندر بے قابو ہو رہا تھا مگر میری آنکھیں سوکھی ہوئی جھیلیں بنی ہوئی تھیں۔

میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ نفرت اور محبت کے درمیان کھڑے ہوئے شخص کو جس عذاب سے گزرنا پڑتا ہے وہ عذاب میں نے جھیل لیا تھا۔

اور جب ہم واپس لندن جا رہے تھے تو لاؤنج کی طرف بڑھتے بڑھتے بابا یکدم رک سے گئے۔

"مجھے تم سے کچھ کہنا ہے بٹو۔"

"جی بابا۔"

"تمہاری اماں بہت اچھی تھیں بٹو---"

"بابا ہمارے ہاں مرنے کے بعد ہر شخص اچھا کیوں ہو جاتا ہے؟" میں گہرے طنز سے بولی۔

"اس نے تمہارے لئے مجھ سے ایک پائی بھی نہیں لی۔"

"ہاں اکٹھے پچاس ہزار جو وصول کر لئے تھے؟"

"وہ سب جھوٹ تھا بٹو---بابا کی آواز کسی اندھے کنویں سے آ رہی تھی۔

"وہ سب جھوٹ تھا؟ نہیں بابا---نہیں---نہیں بابا---سامنے سے گزرتے ہوئے لوگ بڑی حیرت سے ہماری طرف مڑ کر دیکھ رہے تھے۔

"میں نے بہت بڑا ظلم کیا ہے بٹو---اس نے صرف تمہارے اچھے مستقبل کے لئے تمہاری جدائی کی بھاری قیمت چکائی تھی---میں نے کئی بار کوشش کی کہ اس کی کچھ مدد کر سکوں مگر وہ بہت خود دار عورت تھی---وہ جانے کیا کیا کہتے رہے۔ مگر میں نے کچھ نہیں سنا۔ اب سننے سے فائدہ بھی کیا تھا۔ اماں جو اب صرف ایک گزری ہوئی بھولی بھٹکی یاد تھی اور بس۔

"چلئے بابا فلائٹ کا وقت ہو گیا ہے۔"

میں نے بیگ کو کندھے سے ٹکایا اور تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

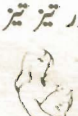

جھیلیں اور آبشار

نگہت آرا چوہان

جھیلیں پانی کے ایسے قطعے ہیں جو زمین کی اوپری سطح کے دبے ہوئے حصوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ان کو نشیب کہتے ہیں۔ جھیلیں نیچی سطح میں پانی کے بہاؤ سے بنتی ہیں۔ جھیل کا پانی عموماً بارشوں اور پگھلی ہوئی برف پر مشتمل ہوتا ہے۔ جھیل کے نشیب میں پانی جھرنوں، چشموں، دریاؤں، زیر زمین چشموں اور زمینی پانی کے ذریعے داخل ہوتا ہے۔

جھیل کا نشیب بہت سے طریقوں سے بنتا ہے۔ بہت سی جھیلیں زمین کی اوپری سطح میں توڑ پھوڑ سے پیدا ہوتی ہیں۔ شمالی امریکہ کی ''لیک سیریز'' اس کی ایک مثال ہے۔ بعض اوقات جھیلیں آتش فشانوں کے ذریعے بھی وجود میں آتی ہیں۔ لاوا بہہ کر کسی وادی کا دہانہ بند کر دیتا ہے اور جھیل کا

نشیب وجود میں آجاتا ہے۔ کبھی آتش فشاں کے پیدا کئے ہوئے شگاف میں پانی بھر جاتا ہے۔ جنوبی علاقے کی کریٹر جھیل اسی کی مثال ہے۔ بہت سی جھیلیں گلیشیروں سے بنتی ہیں۔ عظیم جھیل اور کینڈا کی دینگ جھیل گلیشیر ہی سے بنی ہیں۔ ساحلی علاقوں میں لہروں اور ساحلی بہاؤ سے عارضی جھیلیں وجود میں آجاتی ہیں۔

بعض اوقات کسی دریا کا مرکزی چشمہ مٹی اور کیچڑ سے بہاؤ کی جگہ بند کر دیتا ہے اور دریا ابل پڑتا ہے جس سے وادیاں پانی سے بھر جاتی ہیں اور جھیل بن جاتی ہے۔ جہاں زمین کے نیچے چونے کا پتھر پایا جاتا ہے اس میں زمین کا پانی حل ہو جاتا ہے اور اس طرح بڑے بڑے سوراخ بن جاتے ہیں جن سے جھیل کے نشیب وجود میں آجاتے ہیں۔ فلوریڈا میں ایسی کئی جھیلیں ہیں۔ جھیل مصنوعی طور پر بھی بنائی جا سکتی ہے۔ جب کسی وادی میں بند باندھا جاتا ہے تو یہ پانی روک کر ایک جھیل بنا دیتا ہے جھیل میڈ کولوریڈو دریا پر ہوور ڈیم کی تعمیر سے وجود میں آئی۔

آبشار ایسے چشمے کو کہتے ہیں جو بہت بلندی سے نیچے کی طرف گرتا ہو۔ اگر پانی کم ہو تو یہ جھرنا کہلاتا ہے اور زیادہ ہو تو آبشار۔ کچھ آبشار صرف ایک چشمے کی صورت میں ہزاروں فٹ تک کی تنگ گہرائی میں گرتے ہیں اور کچھ آبشار اپنی چوڑائی اور بہت زیادہ پانی کی وجہ سے مشہور ہیں۔ ویزوئیلا کی اینجل آبشار دنیا کی سب سے اونچی آبشار ہے۔ تقریباً نو سو اسی میٹر۔ یہ آبشار ۱۹۳۵ء میں ایک امریکی جیمس اینجل نے دریافت کی تھی۔ ایشیا کی سب سے لمبی آبشار گیری سوپا ہندوستان میں ہے۔ یہ چار حصوں میں تقریباً دو سو باون میٹر کی اونچائی سے گرتی ہے۔ سب سے زیادہ پانی والی آبشار گوریا ہے جو برازیل اور پیراگوئے کی سرحد پر واقع ہے۔ اس میں فی سیکنڈ ۱۳۶۳۰۹ کیوبک میٹر پانی گرتا ہے۔ یہ اٹھارہ چشمے ہیں لیکن مجموعی گراؤ صرف ساٹھ میٹر ہے دنیا کی ایک اور اونچی آبشار کیلیفورنیا کی ربن فال ہے۔ یہ ایک تنگ چشمہ ہے جو چار سو نوے میٹر کی بلندی پر ایک چٹان سے گرتا ہے۔

دنیا کی دوسری اونچی ترین آبشار جنوبی افریقہ میں پائی جاتی ہے۔ یہ ٹیوگلا آبشاریں کہلاتی ہیں یہ آٹھ سو تریپن میٹر کی بلندی سے گرتی ہیں۔ اس کے علاوہ دنیا کی مشہور ترین آبشار نیاگرا ہے۔ یہ بفیلو نیو یارک سے سولہ میل شمال مغرب میں واقع ہے۔ دراصل نیاگرا کی دو آبشاریں ہیں۔ کینیڈین فال اور امریکن فال۔ کینڈا اور امریکہ کے درمیان بین الاقوامی سرحد کینیڈین فال کے درمیان سے گزرتی ہے۔ دریائے نیاگرا کا چورانوے فیصد پانی یا تقریباً ۰۴۰،۸۵۴، ۷۳لیٹر پانی ہر منٹ میں اس آبشار سے گرتا ہے۔

پڑے گر بیمار

نائلہ صدیقی

ارے بیگم! تم نے سنا؟ جاوید بھائی ہاسپٹل میں داخل ہیں۔" یوسف صاحب نے گھر میں داخل ہوتے ہی اطلاع دی۔ "خدا خیر کرے! کیا ہوا انہیں؟" بیگم یوسف نے گھبرا کر پوچھا۔ "انہیں بخار تھا، ڈاکٹر نے کوئی غلط دوا دے دی، اس کا ری ایکشن ہو گیا۔" یوسف صاحب نے تفصیل بتائی۔ "اف یہ ڈاکٹر ہیں یا گھسیارے؟ نہ جانے کہاں سے ڈگریاں لے کر چلے آتے ہیں؟" بیگم نے بڑبڑانا شروع کر دیا۔ "اچھا اس قصے کو چھوڑو، یہ بتاؤ جاوید بھائی کی عیادت کے لئے چلنا ہے؟" یوسف صاحب نے پوچھا۔ "ہاں ظاہر ہے، یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ یاد نہیں پچھلے سال آپ کا آپریشن ہوا تھا تو جاوید بھائی دوڑے چلے آئے تھے اور دن رات آپ کی تیمار داری کی

تھی، اب کیا ہم ان کی عیادت کے لئے بھی نہ جائیں؟ یہ بتایئے کہ ہاسپٹل کے اوقات ملاقات معلوم کئے آپ نے؟" بیگم یوسف نے پوچھا۔ "ہاں! شام پانچ سے سات بجے تک۔" یوسف صاحب نے بتایا۔ "تو پھر ٹھیک ہے، ہم شام کو چلیں گے۔" بیگم یوسف نے فیصلہ کیا۔ یوسف صاحب سر ہلا کر رہ گئے۔

جاوید بھائی کی بیماری کی خبر سارے خاندان میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ اب ہر ایک شخص ان کی عیادت کے لئے جانے کو بے قرار تھا۔ دراصل جاوید بھائی نہایت خوش اخلاق اور ملنسار شخص تھے۔ جب کبھی کسی کی بیماری کی خبر سنتے فوراً عیادت کرنے پہنچ جاتے۔ دوا علاج کے معاملے میں ہر ممکن مدد کرنے کی کوشش کرتے، اگر کوئی بیمار "تیمار دار" کی نعمت سے محروم ہوتا تو جاوید بھائی یہ کمی بھی پوری کرتے۔ کسی کو خون کی ضرورت ہوتی تو اس کے لئے بھاگ دوڑ کرنا بھی جاوید بھائی کی خدمات میں شامل تھا۔ خاندان کا کوئی فرد نہ تھا جو بیمار ہونے پر جاوید بھائی کی عیادت سے محروم رہا ہو۔ یہی وجہ تھی کہ آج خاندان کا ہر فرد ان کا یہ قرض اتارنے کے لئے بیتاب تھا۔ یوسف صاحب نے ہاسپٹل کے کمرے میں قدم رکھا تو انہیں ایسا لگا جیسے وہ کسی ریلوے اسٹیشن پر آ گئے ہیں۔

کمرہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔ بعض خواتین کا حلیہ دیکھ کر یہ گمان ہو رہا تھا جیسے وہ غلطی سے شادی ہال کے بجائے ہاسپٹل آ گئی ہوں۔ زیادہ تر لوگ جاوید بھائی کے بستر کو گھیرے کھڑے تھے۔ جنھیں بستر کے قریب جگہ نہیں مل سکی تھی وہ پیچھے سے اچک اچک کر عیادت کر رہے تھے۔ کچھ لوگ آگے کھڑے حضرات کو دھکے دے کر سامنے آنا چاہ رہے تھے۔ سلطان صاحب جاوید بھائی کے سرہانے کھڑے ان کے منہ پر جھک جھک کر سگریٹ کا دھواں پھینک رہے تھے۔ سہیل صاحب دوسرے سرے پر کھڑے مسلسل معلومات عامہ کے سوال پوچھ رہے تھے "بھوک لگتی ہے؟ نیند آتی ہے؟ سانس آتی ہے؟"

"ہائے بھائی صاحب! آپ کتنے کمزور ہو گئے ہیں؟" نسرین آپا نے دھاڑ کر کہا۔ "رنگ بالکل پیلا پڑ گیا ہے۔" بستر کے قریب موجود خالہ جان نے پریس ریلیز جاری کیا۔ "ارے بھائی! یہ کس احمق نے پنکھا کھول رکھا ہے؟ اسے تو بند کرو۔" خالو جان نے عیادت کو نیا ٹرینڈ دیا۔ "نہیں نہیں پنکھا چلنے دو، مجھے گھٹن محسوس ہو رہی ہے" جاوید بھائی نے گھبرا کر کہا۔ "گھٹن تو محسوس ہوگی، کھڑکیاں جو بند ہیں، بھئی کھڑکی کھولو کھڑکی، تازہ ہوا اندر آئے گی۔" سلیم صاحب نے چیخ کر کہا۔ "واہ صاحب! آپ تو مریض کے جان کے درپے ہیں۔ کھڑکی کھولنے کا صاف مطلب جاوید بھائی کی جان خطرے میں ڈالنا ہے۔" سہیل صاحب نے کہا۔ "ہاں بھئی ہم تو جاوید بھائی کی جان کے دشمن

ہیں ناں، سچے ہمدرد تو آپ ہی ہیں بس۔" سلیم صاحب نے جل کر کہا۔ "بھابی! آپ نے سر پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں کیوں نہیں رکھیں؟" سلطان صاحب نے بیگم جاوید سے تفتیش شروع کر دی "کس کے سر پر؟" بیگم جاوید بوکھلائیں۔ "ارے جاوید بھائی کے سر پر اور کیا اپنے سر پر؟" سلطان صاحب جھلّا گئے۔ "ڈاکٹر نے کہا نہیں" بیگم جاوید نے سنبھل کر کہا۔ وہ دروازے کے پاس کھڑی تھیں، اندر گھسنے کی جگہ نہیں تھی۔ "واہ بھئی ڈاکٹروں نے ہی تو اس حال کو پہنچایا ہے، پھر بھی آپ ان کی باتوں پر اعتبار کر رہی ہیں، حد ہو گئی۔" سلمیٰ نے سر ہلا کر کہا۔

"ارے جاوید بھائی! جس ڈاکٹر نے آپ کو غلط دوا دی تھی اس کے خلاف رپورٹ کی آپ نے؟" سلیم صاحب نے جاوید صاحب کا بازو کھینچ کر متوجہ کیا۔ "نہیں" جاوید بھائی نقاہت سے بولے۔ "واہ حد ہو گئی بزدلی کی، میرے ایک جاننے والے محکمۂ صحت میں اچھے عہدے پر ہیں، اگر آپ کہیں تو ان کے ذریعے ......" "ہاں ہاں بعد میں دیکھا جائے گا۔" جاوید بھائی نے جان چھڑائی۔ "بعد میں کب؟ فیصلہ صحیح وقت پر کرنا چاہئے۔" خالو جان نے نصیحت کی۔ "اچھا گھر جا کر میں خوب سارے صحیح فیصلے کروں گا۔" جاوید بھائی نے بے زاری سے کہا۔ "بھابی! جاوید بھائی کو ڈرپ لگوایئے۔" بیگم سلطان نے فرمائش کی۔ "ڈاکٹر اگر مناسب سمجھیں گے تو..." بیگم جاوید کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ "واہ بھئی! آپ ڈاکٹروں کی ہر بات مان رہی ہیں، ہماری ایک بھی نہیں۔ ڈاکٹر کیا ہم سے بڑھ کر ہیں؟" بھانجی نے شکایت کی۔ "بھابی! آپ جاوید بھائی کا خیال رکھیئے۔" بیگم سہیل نے مشورہ دیا۔ "رکھ رہی ہوں۔" بیگم جاوید نے بھنّا کر کہا۔ "ارے کیا خاک خیال رکھ رہی ہیں میں دیکھ رہی ہوں جب سے ہم لوگ آئے ہیں آپ نے جاوید بھائی کو کچھ کھانے پینے کے لئے نہیں دیا۔" نسرین آپا نے چمک کر کہا۔ بیگم جاوید گڑبڑا کر پھلوں کی طرف بڑھیں اور سیب کاٹنا شروع کیا۔ "جاوید بھائی کو صحت بخش غذا دیجئے، پھل سوپ جوس وغیرہ۔" سلطان صاحب نے ہاتھ بڑھا کر ایک سیب اٹھاتے ہوئے کہا۔ "تم بھی لو۔" جاوید بھائی نے نقاہت سے پہلو میں بیٹھے یوسف صاحب سے کہا۔ "ارے بھائی صاحب! کیا لوں؟ آپ کو اس حال میں دیکھ کر بھوک پیاس اڑ گئی ہے۔ ویسے بھی میں سیب نہیں کھاتا، کینو دے دیجئے۔" انہوں نے بیچارگی سے کہا۔ "مجھ سے بھی دوپہر کا کھانا تک نہیں کھایا گیا تھا، اب اس وقت کمزوری محسوس ہو رہی ہے۔" خالہ جان نے سیبوں کی طرف دیکھا۔ "بیگم جاوید نے خاموشی سے سیب ان کی طرف بڑھا دیئے۔ "سر درد سے پھٹا جا رہا ہے، کیا یہاں چائے کا کوئی انتظام نہیں؟" سہیل صاحب نے سر پکڑ کر پوچھا۔ "ہاں یہ تھرماس میں ہے۔ کون کون پیئے گا؟" بیگم جاوید نے تھرماس اٹھاتے ہوئے کہا۔

"سب ہی کو دے دیجئے۔ شام کا وقت ہے، سب کو اس وقت چائے پینے کی عادت ہے اور پھر سر میں درد الگ ہو رہا ہے۔" بیگم یوسف نے کہا۔ "ویسے تو تھرماس کی چائے ہوتی بہت بری ہے۔" سہیل صاحب نے چسکی لیتے ہوئے ماہرانہ رائے دی۔ "ارے جاوید بھائی کو نہیں دی چائے؟" بیگم سلطان نے چونک کر پوچھا۔ "لو اب بھلا مریض کو چائے پلائی جائے گی؟ سراسر نقصان دہ شے ہے یہ۔" سلطان صاحب نے خالی کپ میز پر رکھا۔ "آپ نہیں پیئیں گی بھابی؟" بیگم یوسف نے پوچھا۔ "نہیں" بیگم جاوید نے اداسی سے خالی تھرماس کو دیکھا۔ "ارے آپ پھر خالی چائے پی رہے ہیں، کتنی بار سمجھایا ہے چائے کے ساتھ دو بسکٹ لے لیا کریں، خالی چائے مضر ہوتی ہے۔" بیگم سلیم نے کہا اور سائیڈ بورڈ پر رکھا بسکٹ کا پیکٹ سلیم صاحب کی طرف بڑھا دیا۔ انہوں نے دو بسکٹ نکال کر ڈبہ آگے بڑھا دیا۔ ڈبہ ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ تھوڑی دیر بعد خالی پیکٹ ڈسٹ بن میں پڑا بیگم جاوید کو منہ چڑھا رہا تھا۔ "بھائی صاحب! سو گئے کیا؟" نسرین آپا غنودگی کے عالم میں پڑے جاوید بھائی پر جھک کر چلائیں۔ "آں ہاں۔" جاوید بھائی ہڑبڑا کر بیدار ہو گئے۔ "میں نے کہا اب ہم لوگ چلتے ہیں۔ وقت ختم ہو رہا ہے ہمارا تو دل ہی نہیں بھرا آپ کو دیکھتے ہوئے مگر آپ فکر نہ کیجئے۔ جب تک آپ ہاسپٹل میں ہیں ہم لوگ روزانہ آپ کو دیکھنے آئیں گے۔" نسرین آپا نے اطمینان دلایا۔ "ہاں جاوید! تم سوچ رہے ہو گے کہ بچے تمہیں دیکھنے کیوں نہیں آئے؟ تو بھئی بچے تو ماموں کو دیکھنے کے لئے تڑپ رہے تھے مگر اس ہاسپٹل میں بچوں کو ساتھ لانے کی اجازت نہیں ہے۔ مگر تم دل میلا نہ کرو، انشاء اللہ جب تم گھر شفٹ ہو جاؤ گے تو بچوں کو صبح سے لے کر آؤں گی اور رات تک رہوں گی۔" سلمیٰ آپا نے خوش خبری سنائی۔ "اچھا بھئی آرام کیجئے، آپ کو آرام کی سخت ضرورت ہے، ہم لوگ کل آئیں گے۔" سب کی ملی جلی آوازیں ابھریں۔

جاوید بھائی صحتیاب ہو چکے تھے۔ ان کی بیماری اب خواب و خیال بن چکی تھی۔ چھٹی کے دن وہ اطمینان سے ٹی وی کے سامنے میچ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اچانک بیگم جاوید ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوئیں۔ "سنیئے" انہوں نے جاوید صاحب کو مخاطب کیا۔ "ہوں" انہوں نے ٹی وی اسکرین پر نظریں جماتے جماتے کہا۔ "وہ سہیل بھائی بیمار ہیں۔ میں سوچ رہی تھی آج شام کو انہیں دیکھنے چلتے۔" "نہیں نہیں، ہرگز نہیں، میں کسی کو دیکھنے نہیں جاؤں گا، کسی کی عیادت نہیں کروں گا، سمجھیں تم؟" جاوید صاحب نے دھاڑ کر کہا اور گل دان اٹھا کر دیوار پر دے مارا۔ بیگم جاوید پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھتی رہ گئیں!!

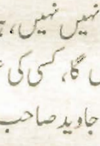

کار برائے اشتہار...

عروبہ منیر

انسان کی جدّت پسند طبیعت اُسے نت نئی چیزیں بنانے پر اکساتی رہتی ہے۔ یہ دو کاریں اِس بات کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ یہ ڈبل کار فی الحال تو ایک کینڈی کمپنی کے اشتہار کے لیے ڈیزائن ہوئی ہے لیکن کچھ عجب نہیں کہ کل کلاں یہ عام استعمال کے لیے دستیاب ہو۔ اور کیا ہی اچھا ہو اگر یہ کسی ایسی قوّت سے چلے جو ماحول کی آلودگی کا سبب بننے کے بجائے اُس کی بہتری کی وجہ بنے۔ جیسا کہ گھاس آلود فوکسی کو دیکھ کر اطمینان ہوتا ہے۔ یہ فوکسی بھی اِستعمال کے لیے نہیں ہے۔ بلکہ سبزیوں کا کاروبار کرنے والے ایک آرٹسٹ کے ذہن کی اِختراع ہے۔ اس نے اپنی گاڑی پر پہلے مٹی کی ایک موٹی تہہ چڑھائی۔ اور اس کے بعد اس میں گھاس اگائی۔ سب سے زیادہ محنت اسے گاڑی کی سائیڈوں پر گھاس اگانے میں کرنی پڑی۔ لیکن بالآخر وہ کامیاب ہوا کیونکہ محنت ہی کامیابی کی کلید ہے...

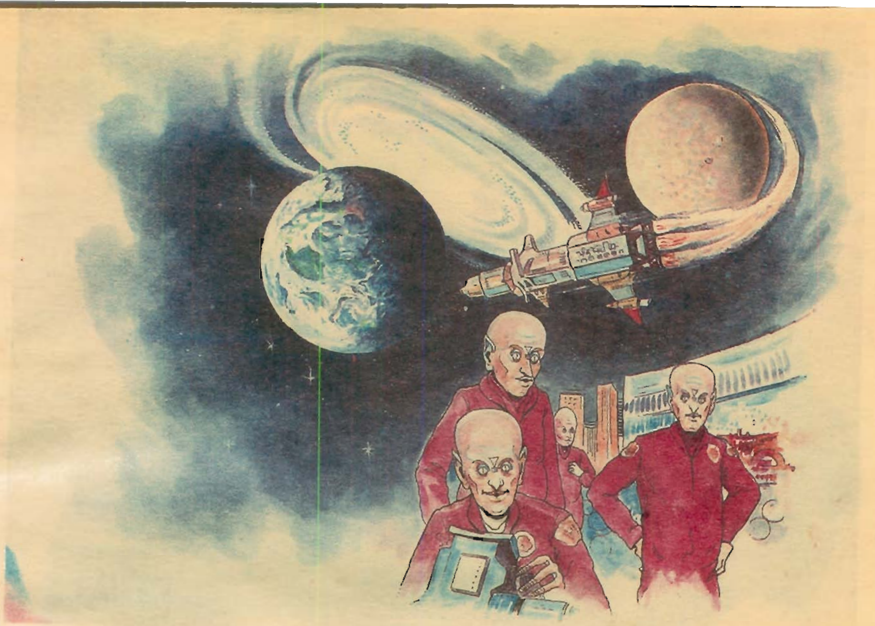

فضا بوجھل

فرزانہ روحی

"آؤ میکو ہم زمین پر چلتے ہیں۔ ذرا دیکھیں تو وہاں کے حالات کیا ہیں؟"

"ضرور زمین پر کوئی گڑبڑ ہے۔ جس کے اثرات اب آسمان تک پہنچ رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری فضا خراب ہو رہی ہے۔ ہمارے خوبصورت گورے گورے بچے کالے کالے دکھائی دینے لگے ہیں۔ آئے دن انھیں نزلہ کھانسی ہوتی رہتی ہے۔ برس ہا برس ایسا تو کبھی نہیں ہوا۔ اب ہم پر یہ افتاد کیوں آن پڑی ہے۔"

"ہاں ٹوٹو۔۔۔۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہمیں ان اسباب کا کھوج لگانا چاہئے۔ زمین پر کوئی بڑا فساد برپا ہے۔ کیونکہ اکثر رات گئے آہیں، کراہیں اور چیخیں سنائی دیتی ہیں۔ یوں لگتا ہے اہل زمین کسی کرب میں مبتلا ہیں۔"

"لیکن میکو زمین تو بہت بڑی ہے۔ خرابی کہاں ہے ہمیں اس کا پتہ کیسے چلے گا؟"

"ہاں ---- یہ بہت اہم سوال ہے۔ اس کے لئے ہمیں ٹیمیں تشکیل دینی پڑیں گی۔ جو اڑن طشتریوں میں بیٹھ کر زمین کا جائزہ لیں گی۔"

آسمانی مخلوق میکو اور ٹوٹو رات گئے اپنے اپنے علاقوں میں بیٹھے آسمانی فضا کی تبدیلی پر تبادلہ خیال کررہے تھے۔ ٹوٹو اور میکو' جو اہم فضائی مخلوق تھے' نے اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اعلان کرایا کہ کرہ ارض پر ریسرچ کی شوقین مخلوق ان کے پاس انٹرویو کے لئے تشریف لائے مگر چار دن گزر جانے کے بعد صرف دوافراد ٹوٹواور میکو کی رصد گاہ تک پہنچے ۔

"اب سے پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا کہ زمین پر جانے کے لئے کوئی تیار نہ ہوا - حالانکہ پہلے زمین کی سیر کے لئے ہمیں مخلوق کا چناؤ کرنا پڑتا تھا۔ بہت سوں کو زبردستی انٹرویو میں فیل کرنا پڑتا تھا۔ ٹوٹو --- تم معلوم تو کرو۔ آخر ایسا کیوں ہوا؟ تمہارا بیٹا بھی تو اس مرتبہ نہیں آیا اسے تو زمین دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔"

"ہاں میکو ---- مجھے یاد آیا۔ میرا بیٹا پوپے بتارہا تھا کہ پروفیسر کیمی کو زمین کے حالات کا علم ہے۔ وہ اپنی رصد گاہ سے زمین کا جائزہ لیتا رہتا ہے۔ یہ بات پوپے کو پروفیسر کیمی کے بیٹے رے آن نے بتائی ہے۔"

"تو پھر چلو --- فوراً" چلو۔ پروفیسر اپنی رصد گاہ میں ہی بیٹھا ہوگا؟"

بلاتاخیر ٹوٹو اور میکو معروف خلائی سائنسدان پروفیسر کیمی کی رصد گاہ پہنچے۔

"ہیلو پروفیسر"۔ ٹوٹو اور میکو نے ایک ساتھ گرم جوشی کے ساتھ کہا۔

"ارے واہ ---- آج تم دونوں کو وقت کیسے مل گیا۔ کیا زمین پر تمہاری ریسرچ ختم ہوگئی؟"

پروفیسر کیمی نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں ان دونوں پر گاڑتے ہوئے پوچھا۔

"اسی سلسلے میں ہم تمہارے پاس آئے ہیں۔ پروفیسر کیا تم نے کرہ ارض سے آنے والی ان چیخوں' آہوں اور کراہوں کو سنا ہے جن کی شدت رات گئے ہماری دنیا کے کاموں میں مداخلت کرتی ہے۔ ایسا لگتا ہے ان آوازوں کے ساتھ ظلم ہوا ہے اور وہ ہم سے مدد مانگ رہی ہوں۔" میکو نے پروفیسر سے کہا۔

"شکر ہے میکو! تمہیں بھی خیال آیا۔ میں تو عرصے سے یہ کراہیں سن رہا ہوں۔ زمین شدید عذاب میں گھری ہوئی ہے۔ اور بعض خطوں میں تو زندگی ختم ہورہی ہے۔ میں اپنی رصد گاہ میں بیٹھا کرہ ارض کا خصوصی جائزہ لیتا رہتا ہوں۔"

پروفیسر کیمی نے ٹوٹو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہوں"--- میکو نے ایک لمبی سانس لی۔

"پروفیسر تمہاری رپورٹ ہماری دنیا میں پھیل چکی ہے۔ کیونکہ ہماری نوجوان مخلوق ریسرچ کے لئے زمین پر جانے کو تیار نہیں۔

معلوم ہوا ہے کہ تم نے موجودہ زمین کے بارے میں خوفناک باتیں پھیلا رکھی ہیں۔"

"لیکن مسٹر میکو --- میری رپورٹ غلط نہیں ہے۔ اگر ہماری مخلوق زمین پر گئی تو اس سے ہماری دنیا میں بھی آگ بھڑک اٹھے گی۔"

"وہ کیسے؟؟" ٹوٹو اور میکو ایک ساتھ پوچھ بیٹھے۔

وہ ایسے کہ --- زمین پر بے شمار جراثیموں نے حملہ کر رکھا ہے۔ جس سے نہ صرف انسان بلکہ جانور یہاں تک کہ پیڑ پودے بھی تباہ ہو رہے ہیں۔ لیکن چند جراثیم ایسے ہیں جو نہایت تباہ کن ہیں۔ جنہیں ایک انسان دوسرے انسان کے خلاف استعمال کر رہا ہے۔"

"وہ کیسے جراثیم ہیں پروفیسر؟" پروفیسر کیمی بولتے بولتے رکے تو ٹوٹو نے پوچھا۔

"بس یہی معلوم نہ ہو سکا۔ میرا خیال ہے۔ یہ معلوم کرنے کے لئے ہمیں زمین کے ان خطوں کا دورہ کر کے ریسرچ کرنا پڑے گی۔"

پروفیسر یہ کہہ کر سوچ میں پڑ گئے اور بولے۔ "ٹوٹو اور میکو ہمیں چاہئے کہ ساتھ مل کر ان اسباب کا کھوج لگائیں۔ اور احتیاطی تدابیر اختیار کر لیں۔ ورنہ آئندہ وہ جراثیم ہماری دنیا پر بھی حملہ آور ہو سکتے ہیں۔" پروفیسر کیمی پر تشویش لہجے میں بولے۔

"کیمی --- اگر زمین کے حالات اتنے ہی خراب ہیں تو کہیں ایسا نہ ہو کہ زمین پر جانے والی ہماری مخلوق ان جراثیموں کو اپنے ساتھ لے آئے۔ نتیجتاً ہماری دنیا خراب ہو جائے۔"

میکو نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔ تو پروفیسر بولے۔ "اس کا بندوبست تو ہم بعد میں کر لیں گے ابھی ہمیں اس خطرناک خطے پر اپنی سہ رکنی ٹیم بھیجنی ہوگی جو جلد از جلد ہمیں رپورٹ دے گی۔"

"یہی تو پرابلم ہے پروفیسر کوئی کرہ ارض کا رخ کرنے پر تیار نہیں ہے۔" میکو نے بتایا "اچھا" --- کچھ توقف کے بعد پرفیسر دوبارہ گویا ہوئے۔ "کیوں نہ ہم تینوں اپنے اپنے بیٹوں کو اس مشن پر بھیج دیں!۔" یہ تجویز پیش کرتے ہوئے پروفیسر نے دونوں کی طرف دیکھا۔ "ہاں --- ایسا ممکن ہے۔ تینوں آپس میں دوست بھی ہیں۔"

یہ بات طے ہو جانے کے فوری بعد میکو، ٹوٹو اور کیمی کے بیٹوں پوپے، رے آن اور ٹف کو زمینی سفر پر روانہ کر دیا گیا۔

تینوں اس وقت اسی رصد گاہ میں بیٹھے تھے کہ میکو چلایا۔ "ارے یہ کیا ہمارا رابطہ زمینی دنیا سے منقطع ہو گیا۔ ہمارے بیٹے۔" ٹوٹو بھی چیخا۔ "پریشانی کی کوئی بات نہیں ہمارے بچے بہت سمجھ دار ہیں۔ وہ حالات کو ضرور سنبھال لیں گے۔" کیمی نے انہیں تسلی دی۔

پانچ دن کے بعد ہی یکایک یہ سہ رکنی ٹیم واپس اپنی آسمانی دنیا میں آگئی۔ سب نے نوٹ کیا

کہ تینوں کے نہ صرف چہرے تبدیل ہو گئے ہیں بلکہ آپس کے گہرے دوست ایک دوسرے سے روٹھے ہوئے بھی ہیں۔

"پروفیسر۔۔۔ لگتا ہے ہمارے بچوں پر زمینی جراثیموں نے حملہ کردیا۔ ان کے چہرے پر چاند کی ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی کی لہروں کے بجائے سیاہ سائے لہرا رہے ہیں۔" میکو گھبراہٹ کے عالم میں پروفیسر کو بتا رہا تھا۔ "ٹوٹو تم ایسا کرو کہ تینوں کو ایک جگہ ہی رکھو تاکہ ہم ان پر پڑنے والے اثرات کا بہتر طریقے سے جائزہ لے سکیں۔"

"مگر یہ تینوں کچھ بول ہی نہیں رہے۔ بلکہ جب نیند میں ہوتے ہیں تو بڑبڑاتے رہتے ہیں۔ اس لئے سب سے پہلے ان کے اندر کے خیالات معلوم کرو۔"

"بالکل ٹھیک۔۔۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔"

پھر تینوں نے اپنے اپنے بیٹوں کے ذہنوں کا تجزیہ کرنا شروع کردیا۔ تو پتہ چلا کہ تینوں کے ذہنوں میں ایک دوسرے کے متضاد خیالات گردش کررہے ہیں۔ یہ رپورٹ مرتب کرنے کے بعد جب ان کے حالات درست ہوئے اور وہ تینوں دوبارہ آسمانی فضا کے زیر اثر آگئے تو کیمی کے بیٹے ٹف نے بتایا۔

"ڈیڈ۔۔۔ جب ہم اپنی گاڑی میں اڑتے ہوئے زمین کے اس خوفناک حصے میں پہنچے تو وہاں ہمارا دم گھٹنے لگا۔ اس کے بعد آپ سے ہمارا رابطہ ختم ہوگیا۔ چار زمینی افراد ہماری گاڑی کو اڑن طشتری کہتے ہوئے ہماری جانب لپکے۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے ایک لمبی سی مشین کا رخ ہماری جانب کردیا۔ جس میں سے تڑتڑ، تڑتڑ کی بھیانک آواز کے ساتھ شعلے نکلنے لگے۔ بڑی مشکل سے ہم نے اپنی گاڑی کا رخ دوسری طرف موڑا۔ مگر وہاں تو حالات مزید خراب تھے۔ فضا میں عجیب سی بو پھیلی ہوئی تھی معلوم ہوا کہ وہ بارود اور خون کی بدبو ہے۔ جگہ جگہ زمینی مخلوق اپنے ہاتھوں میں خوفناک مشین لئے ایک دوسرے پر شعلے برسا رہی تھی۔ وہاں سے بھی ہم بچتے بچاتے دوسری سمت اڑے اور ایک وسیع سرسبز اراضی پر اتر گئے۔ وہ کسی کا بہت بڑا گھر تھا جس کے لان میں ہم نے قیام کیا۔ ہم نے گھر میں موجود لوگوں کی آواز ریکارڈ کرنے کی کوشش کی۔ اور جب اسے سنا تو اس میں آٹھ دس افراد آپس میں ایک دوسرے کے خلاف زہریلی گفتگو کررہے تھے۔ سب کو ایک دوسرے پر شک تھا۔ ہر آدمی ایک دوسرے کو اپنا چھپا دشمن سمجھ رہا تھا۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کی برائیاں ثابت کرنے میں ایسی ایسی مثالیں پیش کررہے تھے جنہیں سن کر ہم دنگ رہ گئے۔ پھر ہم تینوں نے وہی برائیاں اپنے آپ میں ڈھونڈنی شروع کردیں جس

کے بعد ہم تینوں میں ایک دوسرے کے خلاف وہی باتیں بھر گئی ہیں۔ ہمارا کام میں دل نہ لگا۔ اس سے پہلے کہ ہم بھی زمینی افراد کی طرح ایک دوسرے کو مار ڈالتے۔ ہم نے واپسی کا قصد کیا۔"
ٹف کے طویل بیان کو سب حیرت سے منہ کھولے سن رہے تھے۔

پروفیسر کیمی بولے "ٹوٹو، میکو! زمین پر نہایت بھیانک جراثیم پیدا ہو گئے ہیں۔ جنہوں نے ہمارے بیٹوں کو بھی اپنے قبضے میں کرنا چاہا۔ اچھا ہی ہوا کہ یہ جلد واپس آگئے ورنہ ہماری دنیا ہی اجڑ جاتی اب ان تینوں کو ایک جگہ قید کر دو جہاں ان کا علاج ہوگا تب انہیں اسی وقت رہائی ملے گی جب ان کے ذہنوں سے زمینی جراثیمو ں کے اثرات مکمل طور پر ختم ہو جائیں گے۔ اگر ہم نے انہیں آزاد رکھا تو ان میں موجود جراثیم ہماری دنیا کی دوسری مخلوق پر بھی حملہ آور ہو جائیں گے۔ آج کے بعد ہم زمین کا رخ اس وقت تک نہیں کریں گے جب تک زمین پر موجود انسان اپنے حالات خود نہ سدھار لے۔"

پروفیسر کیمی کے فیصلے کو سن کر میکو بولا۔

"ہمارے زمین پر نہ جانے سے زمین والوں کا کیا بگڑے گا پروفیسر! نقصان میں تو ہم ہی رہیں گے!" "نہیں میکو! ان کا بھی کام رکے گا جب ہم زمین پر جاتے ہیں تو ان کے سائنس دان ہمارا جائزہ لے کر نت نئے تجربات سے زمین والوں کو آگاہ کرتے ہیں۔ اب وہ بے کار ہو جائیں گے۔ اور آئندہ حالات کا جائزہ نہ لے سکیں گے۔ اور ہاں سنو --- زمینی مخلوق بھی ہماری دنیا میں نہ آئے ۔ زمین سے آنے والے تمام سیارچوں اور دوسرے ذرائع پر پابندی لگا دو۔ جیسے ہی ہماری دنیا میں داخل ہوں ان پر تابکاری شعاعوں کا حملہ کر کے انہیں واپس جانے پر مجبور کر دیا جائے۔ تاکہ وہ اپنے جراثیم یہاں نہ پہنچا سکیں۔"

میکو بولا۔ "پروفیسر اس کے علاوہ اپنی دنیا کے اردگرد ایسی دواؤں کا اسپرے بھی کرنا چاہئے جن سے ان جراثیمو ں کا مکمل خاتمہ ہو جائے جو ہوا کے ساتھ ہماری فضائی حدود میں داخل ہو سکتے ہیں۔"

"ہاں ہاں --- بالکل ٹھیک۔" ٹوٹو نے میکو کی تائید کی۔

اس کے بعد وہ تینوں ایک جگہ بیٹھ گئے۔ پروفیسر کیمی بولے۔ "اف --- یہ انسان نے اپنی کیا حالت بنالی ہے۔ ان کی تباہی و بربادی کا حال دیکھ کر تو مجھے شرم آرہی ہے پتہ نہیں انہیں "شرم" بھی آتی ہے یا نہیں۔"

آنکھ مچولی کا تحفہ

آپ کے ایسے دوست جو آنکھ مچولی پڑھنا چاہتے ہوں لیکن اسے خریدنے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں، آپ انہیں آنکھ مچولی کا تحفہ مفت پیش کر سکتے ہیں آپ ان کا نام اور پتا کوپن میں لکھ کر ہمیں بھیج دیجئے۔۔۔۔۔۔۔ادارہ ان میں سے بذریعہ قرعہ اندازی دس ساتھیوں کو اپنا ممبر بنالے گا اور انہیں ایک سال کے لئے آنکھ مچولی مفت جاری کر دیا جائے گا۔اس طرح آپ ایک نیک کام کریں گے اور ادارہ آنکھ مچولی کو بھی ایک نیک کام کرنے کا موقع فراہم کریں گے۔

آپ کی تصویر ہم شائع کریں گے مگر

ضروری ہے کہ . . رنگین اور کم از کم پوسٹ کارڈ سائز کی ہو۔

- تصویر کا رنگین ہونا ہی کافی نہیں . . . واضح، دلکش اور منفرد ہونا بھی ضروری ہے۔
- تصویر اسٹوڈیو یا گھر کسی حصّے کے بجائے آؤٹ ڈور ہو۔

تصاویر کے لئے چند دلچسپ موضوع (۱) رونا یا ہنسنا (۲) شرارت (۳) ایڈونچر، (۴) اہم مصروفیت (۵) کسی اہم یا مشہور جگہ پر (۶) کھیلتے ہوئے یا کوئی بھی دلچسپ موضوع۔

- ناقابلِ اشاعت تصاویر صرف جوابی لفافے کی صورت میں واپس بھجوائی جائیں گی۔
- اپنی تصاویر نام اور پتے کے ساتھ علیحدہ لفافے میں اس پتے پر پوسٹ کریں۔

آنکھ مچولی البم ۔ ماہنامہ آنکھ مچولی ۔ ا۔ پی آئی بی کالونی کراچی نمبر ۵

محمد جاوید خالد

جھگڑا، لڑائی ہے اک برائی
بٹتی ہے طاقت گھٹتی ہے طاقت
سُن اے مسلماں کہتا ہے قرآن
والصلح خیر والصلح خیر

دنیا ہے گھر کی یہ بات شر کی
جس دم ہے آئے گھر کو بنائے
جنگل سے برتر سن اور عمل کر
والصلح خیر والصلح خیر

نااتفاقی برکت اڑاتی
گھر کو اکھاڑے بچے بگاڑے
اثرات گندے سن رب کے بندے
والصلح خیر والصلح خیر

اور جب قبیلے کر کر کے حیلے
لڑتے ہیں باہم کرتے ہیں خود کم
اپنی ہی گنتی ناداں سمجھ بھی
والصلح خیر والصلح خیر

مضبوط قومیں جب یہ نہ سمجھیں
جھگڑوں میں پڑ کر آپس میں لڑ کر
یوں ٹوٹیں جیسے کچے ہوں دھاگے
والصلح خیر والصلح خیر

جب صلح آئے الفت کو لائے
طاقت بنائے سب کو دکھائے
دشمن کے سائے رہنے نہ پائے
والصلح خیر والصلح خیر

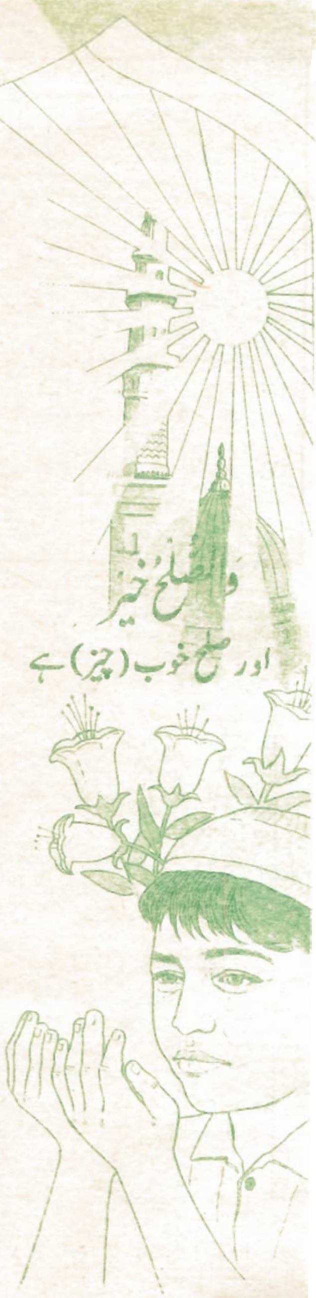

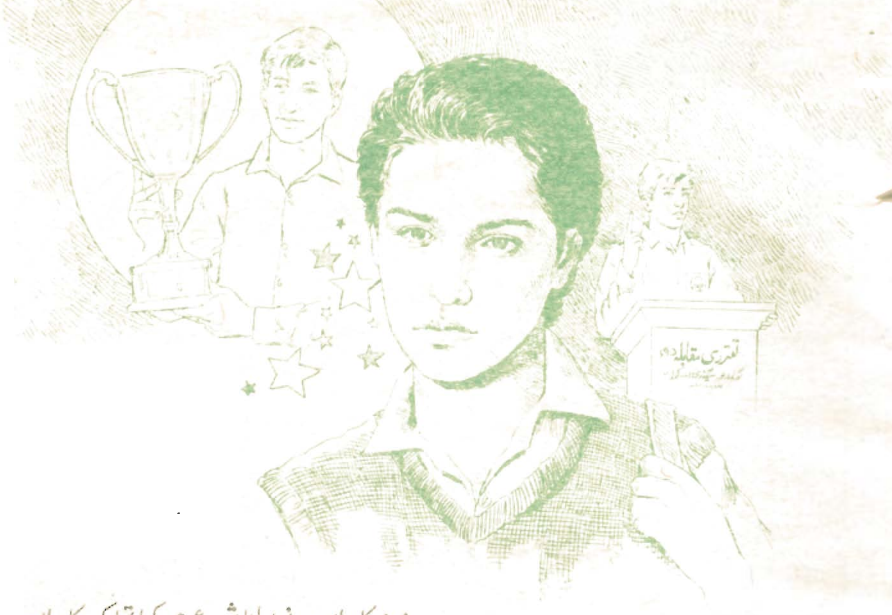

فاتح

سلمان غزالی

"پاپا جلدی کریں، مجھے دیر ہو رہی ہے۔"

قاسم نے سینڈوچ کا ایک بڑا سا لقمہ نگلتے ہوئے دروازے سے آواز لگائی۔ اس کے ایک کاندھے پر اسکول بیگ تھا اور دوسرے ہاتھ میں سینڈوچ تھا جسے وہ چلتے پھرتے کھاتا جا رہا تھا۔ قاسم کی آواز سن کر کامران صاحب نے اپنا سینڈوچ ختم کیا اور پیالی میں آدھی چائے چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"ارے اتنی بھی کیا دیر ہو گئی، چائے تو....."

مسز کامران نے بولنا شروع ہی کیا تھا کہ کامران صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

"بس، میں جا رہا ہوں۔" کامران صاحب قاسم کی بے چینی کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ آج کا دن قاسم کے لئے کتنا اہم ہے۔

باہر قاسم گاڑی کا دروازہ کھولے ہوئے کامران صاحب کا منتظر تھا۔

"پاپا آپ آئیں گے نا"۔ قاسم نے اسکول کے گیٹ پر گاڑی سے اترتے ہوئے پوچھا۔

"انشاء اللہ، بیٹا آپ کی باری آنے سے پہلے میں پہنچ جاؤں گا۔ گڈ لک۔" کامران صاحب نے پیار بھری نظروں سے قاسم کو دیکھا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

آج قاسم کے اسکول میں سالانہ تقریری

مقابلے تھے۔ چھٹی سے آٹھویں کلاس تک کے طلباء ایک کٹیگری میں آتے تھے اور نویں اور میٹرک کے طلبا کے علیحدہ مقابلے ہوتے تھے۔ قاسم آٹھویں جماعت کا طلب علم تھا، پچھلے دو سالوں سے وہ مستقل اول انعام حاصل کر رہا تھا اور اس سال کا مقابلہ جیتنا تو جیسے اس کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ بن گیا تھا۔ وہ یہ مقابلہ ہر قیمت پر جیتنا چاہتا تھا اور اس مقابلے کے لئے اس نے محنت بھی بہت زیادہ کی تھی۔ جب پہلی دفعہ قاسم نے اس مقابلے میں حصہ لیا تھا تو اس نے سوچا بھی نہ تھا کہ وہ اول آ جائے گا اور نہ ہی انعام اور پوزیشن کی اسے کوئی پروا تھی۔ دوستوں کے کہنے پر اس نے بنا کسی خاص تیاری کے یونہی تقریر کر دی تھی۔ اور اس کے بھرپور انداز اور خوبصورت ادائیگی نے اسے پہلا انعام دلوا دیا۔ اول آنے کا وہ احساس بڑا خوش کن تھا۔ اس وقت مقابلے کے بعد اسے پہلی دفعہ مقابلے کا مزا آیا، ورنہ نتائج کا اعلان ہونے سے پہلے تک وہ بڑا لاتعلق بیٹھا تھا اور تمام لوگوں کی طرح اس کا بھی یہی خیال تھا کہ عاصم اس کا کلاس فیلو اور دوست ہی اول انعام کا حقدار ٹھہرے گا جس نے اس مقابلے کے لئے بہت تیاری کی تھی اور بڑے شوق سے حصہ لیا تھا۔ اس جیت نے قاسم کے اندر شوق کو بیدار کیا اور اگلے سال اس نے مقابلے کے لئے خوب تیاری کی۔ مقابلہ بڑا سخت تھا مگر جیت پھر قاسم کی ہوئی۔ دوسری جیت پر قاسم کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ اب اسے جیت کا مزہ آنے لگا تھا اور جیت کا مزہ بھی کسی نشے کی طرح ہوتا ہے۔ ٹوٹنے لگے تو برداشت نہیں ہوتا۔ قاسم نے اسی دن فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اگلے سال بھی ہر حالت میں یہ مقابلہ جیتے گا۔ کوئی بھی مقابلہ مسلسل تین سال جیتنے والے کے لئے اسکول والوں نے ایک بڑا کپ اور خاص انعام رکھا ہوا تھا شہر کا ایک بڑا اور سب سے اچھا اسکول ہونے کے ناطے سے یہاں کے تمام طالب علم بہت ہونہار تھے اور مقابلہ اتنا سخت ہوتا تھا کہ کسی بھی ایک اسٹوڈنٹ کے لئے مسلسل تین سال تک ایک اعزاز برقرار رکھنا بہت مشکل کام تھا پچھلے کئی سالوں سے یہ خصوصی اعزاز کوئی بھی حاصل نہیں کر سکا تھا اور اسی چیز نے قاسم کے دل میں بیدار ہونے والی خواہش کو شدید تر کر دیا تھا۔ اور اس دفعہ یہ مقابلہ جیتنا اب قاسم کا سب سے بڑا خواب بن چکا تھا۔ پچھلے ایک سال سے وہ یہ ہی خواب دیکھ رہا تھا کہ ایک بڑا سا کپ ہاتھوں میں تھامے وہ اسمبلی ہال کے اسٹیج پر کھڑا ہے اور تمام اسکول والے تالیاں بجا کر اسے مبارکباد دے رہے ہیں۔ اب اس خواب کی تعبیر کھلی آنکھوں سے دیکھنے کا وقت آ گیا تھا۔ اس دفعہ تیاری میں قاسم نے کسی قسم کی کوئی کسر نہیں رہنے دی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس دفعہ عاصم نے بھی خاص تیاری کی ہے مگر قاسم کو اپنی صلاحیتوں اور تیاری پر پورا اعتماد تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ ضرور جیتے گا۔ مگر اس کے باوجود آج وہ کافی پریشان تھا، بہرحال موقع کی نزاکت کے تحت یہ ایک قدرتی بات تھی اور قاسم

خود کو پُرسکون رکھنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔
قاسم کے دوست، ساتھی، ٹیچر سب ہی قاسم کا حال پوچھ رہے تھے اور گڈ لک کہہ رہے تھے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں تھا کہ قاسم ہی ''ہارٹ فیورٹ'' تھا اور اس بات نے قاسم کے حوصلے بہت بلند کر دیئے تھے۔
تقریریں شروع ہو چکی تھیں سب ہی لڑکوں نے خوب تیاری کی ہوئی تھی اور مقابلہ کافی سخت دکھائی دیتا تھا، قاسم کی باری کافی دیر سے تھی اور قاسم کے ابو نے وعدہ کیا تھا کہ اس کی باری سے پہلے ضرور آ جائیں گے۔ قاسم بے چینی سے ان کا منتظر تھا۔ آج کا یہ مقابلہ وہ ان کی موجودگی میں جیتنا چاہتا تھا۔ عاصم اسٹیج پر جا چکا تھا اور قاسم بڑے غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ عاصم نے تقریر شروع کی اور اس کی ابتدائی چند کلمات نے ہی جیسے حاضرین پر سحر طاری کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ چھا گیا تھا۔ اس کی تقریر واقعی بہت عمدہ تھی جس میں بظاہر کوئی جھول تلاش کرنا ناممکن تھا۔ ایک لمحے کو قاسم کو اپنا دل ڈوبتا سا محسوس ہوا، اسے یوں لگا جیسے اس سے بہتر پرفارمنس کوئی نہیں دے سکے گا مگر فوراً ہی اس نے خود کو سنبھال لیا، اس نے اپنا اعتماد متزلزل نہیں ہونے دیا۔ اسے اپنے استاد کی بات یاد تھی کہ دنیا میں کوئی چیز بہترین نہیں ہوتی مزید بہتری کی گنجائش ہمیشہ رہتی ہے اور اسے یقین تھا کہ وہ اس سے بہتر کارکردگی دکھا سکتا ہے۔
قاسم کی باری سے کچھ دیر پہلے کامران صاحب آ گئے۔ اپنے پاپا کو دیکھ کر قاسم کی ہمت دگنی ہو گئی اور اس کا یقین اور مضبوط ہو گیا تھا۔ مہمانوں کیلئے علیحدہ کرسیاں رکھی گئی تھیں۔ کامران صاحب دور سے ہی اسے اشارے سے گڈلک کہہ کر بیٹھ گئے تھے۔
قاسم اسٹیج پر آیا تو کامران صاحب وہیں سے اسے بند مٹھی کے ساتھ ''بک اپ'' کر رہے تھے۔ قاسم نے بھرپور حوصلے اور جوش کے ساتھ تقریر کا آغاز کیا تو جج سمیت وہ تمام لوگ جنہوں نے عاصم کی تقریر کے بعد سوچا تھا کہ شاید مقابلے کا فیصلہ ہو گیا ہے وہ سب دوبارہ سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ کئی جگہ پر تو اس نے لوگوں کو بے اختیار داد دینے پر مجبور کر دیا۔ جب قاسم تقریر ختم کر کے اسٹیج سے نیچے اترا تو اس کا چہرہ طمانیت کے احساس سے دمک رہا تھا۔ یقیناً اس سے بہتر پرفارمنس وہ نہیں دے سکتا تھا اس نے اپنا لوہا ایک دفعہ پھر منوالیا تھا۔ اس دفعہ وہ آ کر اپنے پاپا کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، کامران صاحب نے اس کا ماتھا چوم لیا تھا۔
''مجھے فخر ہے تم پر بیٹے، انشاءاللہ اوّل تم ہی آؤ گے۔'' کامران صاحب نے کہا تو قاسم کو یوں لگا جیسے اسے سند مل گئی ہو۔ اب اسے پورا یقین تھا کہ اس کا خواب پورا ہو گا۔ وہ ہی اول انعام کا حقدار ٹھہرے گا مگر اس کے باوجود اک بے چینی سی تھی جو نتائج کے اعلان سے پہلے ختم نہیں ہو سکتی تھی۔
مقابلے کا اختتام ہو چکا تھا اور ملک کے مشہور

دانشور جو مہمان خصوصی اور جج بھی تھے اسٹیج پر آ چکے تھے، ان کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا جس پر نتائج تحریر تھے۔

"مجھے یہ کہتے ہوئے دلی خوشی محسوس ہو رہی ہے اور میں پرنسپل صاحب کو مبارک باد دینا چاہوں گا کہ اس اسکول کے تمام بچے ہی بہت ہونہار ہیں۔ ان سب کی قابلیت نے مجھے بہت متاثر کیا ہے اور ایسے میں فیصلہ کرنا بہت مشکل کام تھا خاص طور پر اوّل اور دوم انعام کے حقدار لڑکوں کو میں خصوصی مبارکباد دوں گا کہ ان دونوں کی ہی کارکردگی لاجواب تھی۔ بہرحال انیس بیس کا فرق تو ہمیشہ رہتا ہے جس کی بنیاد پر اول دوم کا فیصلہ ہوتا ہے۔ میری نظر میں اول انعام کے حقدار ہیں......"

قاسم کو یوں لگا جیسے وقت تھم گیا ہو، ہر طرف اسے اپنے ہی دل کی دھڑکن سنائی دے رہی تھی، اس موقع کا انتظار اس نے پورا ایک سال کیا تھا، اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

میز کے کونے پر پڑا ہوا وہ خصوصی انعام اور بڑا سا کپ جو ہر سال میز پر ہی پڑا رہ جاتا تھا، قاسم کی نظروں میں ہوا میں بلند ہوتا جا رہا تھا اور پھر ایک چھناکے کے ساتھ جیسے سارا سکوت ٹوٹ گیا۔ وہ بڑا سا کپ دھڑام سے زمین پر گر گیا......، پورا ہال تالیوں سے گونج رہا تھا اور ...... عاصم پہلا انعام وصول کرنے اسٹیج کی طرف جا رہا تھا۔

قاسم تو جیسے سکتے کی حالت میں آ گیا تھا، اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ ہار کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا وہ تو جب جیتنے کی خواہش نہیں رکھتا تھا تب بھی جیت جاتا تھا اور اس دفعہ ...... جب اس نے اتنی محنت، اتنی تیاری کی تھی وہ تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا ...... یہ سب کچھ اسے خواب لگ رہا تھا، اس کی کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا ...... دوسرے انعام کے لئے اس کا نام پکارا جا رہا تھا مگر اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا، وہ تو جیسے یہاں تھا ہی نہیں۔

اٹھو بیٹے، اِٹس اوکے۔" کامران صاحب نے اسے شانے سے پکڑ کر ہلایا۔ "تمہارا نام پکارا جا رہا ہے، جا کے اپنا انعام وصول کرو...... چلو۔"

قاسم اپنا انعام لے کر اسٹیج سے اترا تو اسے کچھ اندازہ نہ تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ کامران صاحب اپنی سیٹ پر سے قاسم کو دیکھ رہے تھے کہ اس کے دوستوں نے اسے گھیر لیا تھا۔ مگر جلد ہی انہیں احساس ہوا کہ وہ واپس اس طرف نہیں آ رہا تھا اور نہ ہی سامنے کہیں نظر آ رہا تھا۔

قاسم کلاس رومز کی پچھلی طرف کاریڈور میں ایک ستون سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ یہ اس کی پہلی ہار تھی اور ایک عجیب سے احساس نے اسے گھیرا ہوا تھا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس کیفیت سے گزر رہا ہے۔ اسے وہ وقت یاد آ رہا تھا جب وہ سوچا کرتا تھا کہ آخر لوگ ہار کیوں جاتے ہیں۔ جب دو انسان کسی چیز کے لئے اپنی پوری محنت کرتے ہیں تو ان میں سے ایک کیوں جیتتا ہے دوسرا کیوں ہار جاتا ہے۔

"پاپا آخر ایک ہی جیسے دو آدمیوں میں ایک کیسے جیت جاتا ہے اور دوسرا کیوں ہار جاتا ہے؟" اس نے کنفیوز ہو کر اپنے پاپا سے پوچھا تھا۔

"بیٹا جو زیادہ محنت کرتا ہے وہ جیت جاتا ہے۔" کامران صاحب نے جواب دیا تھا۔

"اور اگر دونوں ایک جتنی محنت کریں تو؟"

"تو پھر جس کے مقدر میں جیت ہوتی ہے وہ جیت جاتا ہے جس کی قسمت میں ہارنا لکھا ہوتا ہے وہ ہار جاتا ہے۔" کامران صاحب نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا تھا۔ "جیسے ہمارے بیٹے کے مقدر میں جیتنا ہی جیتنا لکھا ہے۔" مگر یہ مقدر والی بات اسے پسند نہیں آئی تھی۔ "یہ تو انصاف نہ ہوا۔" اس نے سوچا تھا۔

"بیٹا آپ ادھر کیا کر رہے ہیں۔" کامران صاحب کی آواز نے اسے چونکا دیا تھا۔ وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا "کچھ نہیں پاپا، بس ایسے ہی۔" قاسم نے کہا، مگر حقیقت اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ کامران صاحب نے اسے آگے بڑھ کے سینے سے لگا لیا۔ "میں جانتا ہوں بیٹے تمہیں شکست کا دکھ ہے مگر یہ رویّہ مناسب نہیں، ہار جیت تو زندگی میں چلتی رہتی ہے۔ جس طرح جیت اور کامیابی ہر کھیل، ہر مقابلے اور ہر انسان کی زندگی کا لازم جزو ہوتی ہے بالکل اسی طرح ہار اور ناکامی بھی ساتھ ساتھ ہوتی ہے۔ کبھی ہار کبھی جیت اس کا نام زندگی ہے، جانتے ہو کسی ایک شخص کی مسلسل جیت کا مطلب کیا ہے؟ کسی دوسرے کی مسلسل ہار، تو پھر یہ تو انصاف نہ ہوا نا۔ تم تقدیر اور انصاف کا ہمیشہ پوچھا کرتے تھے نا تو بس بیٹا اتنی سی بات ہے۔ اس دنیا میں ہر شخص صرف اسی طرح خوش رہ سکتا ہے کہ کبھی کسی کی جیت ہو اور کبھی کسی اور کی یہی تقدیر کا انصاف ہے یہی وہ توازن ہے جس کے باعث دنیا چل رہی ہے۔ تم دو دفعہ جیت کر ہارے ہو تم اپنے اس دوست کے بارے میں سوچو جو دو مرتبہ ہار کر جیتا ہے۔ جسے یہ کامیابی تین سال کے بعد ملی ہے۔ اگر وہ اپنی ناکامیوں سے ہمت ہار جاتا تو وہ یہ کامیابی کیسے حاصل کرتا؟" عاصم کے ذکر پر قاسم کو یاد آ گیا کہ عاصم ہر دفعہ اسے مبارکباد دیتا تھا جیتنے پر۔ "پاپا میں ذرا عاصم کو مبارکباد دے آؤں۔" قاسم نے کہا اور ہال کی طرف چل دیا۔ قاسم نے دور سے عاصم کو دیکھا تو پاپا کی کہی ہوئی ساری باتیں ایک لمحے میں اسے سمجھ آ گئیں۔ عاصم خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا، اس کے چہرے پر کھلتے گلاب دیکھنے کے لائق تھے۔ "یقیناً" قاسم نے سوچا۔ "جس طرح مجھے جیت نصیب ہوئی تھی اسی طرح کامیابی ہر محنت کرنے والے شخص کا حق ہے۔"

"عاصم بہت بہت مبارک ہو۔" قاسم نے پاس جا کر عاصم کو مخاطب کیا۔ عاصم نے اسے دیکھ کر مسکراتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھایا تو قاسم نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔ جیت کسی اور کی تھی مگر جیت کی اصل خوشی قاسم کو آج ہوئی تھی۔

میرے بچپن کے دن

مرتب: سلیم خالق

عمران خان ۲۵ نومبر ۱۹۵۲ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کہتے ہیں "عمران کی پیدائش پر مجھے بہت بڑی خوشی ملی عمران میرا اکلوتا بیٹا ہے۔ مگر آج تک مجھے یہ احساس نہ ہوا کہ یہ میرا اکلوتا بیٹا ہے اور اس ناطے اسے خصوصی لاڈ و پیار ملنا چاہئے۔ دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ اس کے ناز نخرے اٹھانے کے بجائے میں نے اس کے ساتھ قدرے سختی کا رویہ اپنائے رکھا اور اپنی بیٹیوں کے ساتھ قدرے نرمی برتی۔"

جب عمران خان کی عمر ایک سال ہوئی تو ان کی والدہ برٹ انسٹی ٹیوٹ میں منعقدہ ریڈ کراس کے میلے میں ان کو لے کر گئیں۔ گول مٹول، سرخ و سفید اور صحت مند عمران کو صحت مند بچوں میں اوّل انعام کا حقدار قرار دیا گیا۔ جب اس بارے میں عمران کے والد اکرام اللہ نیازی صاحب کو پتا چلا تو بے ساختہ ان کے منہ سے نکلا

Its a lucky Start

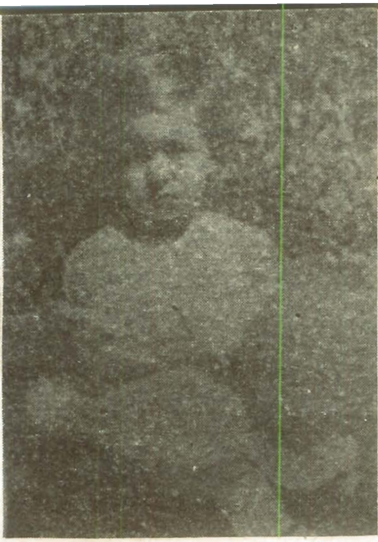

عمران خان کا بچپن

آج لگتا ہے کہ انہوں نے ٹھیک ہی کہا تھا۔

عمران ابھی چھوٹے ہی تھے کہ انہیں کرکٹ کھیلنے کا شوق ہوگیا۔ ان کے والد لندن جا رہے تھے۔ عمران نے اپنے والد سے کہا کہ "آغا جان میرے لئے ایک کرکٹ بیٹ ضرور لے کر آیئے گا۔" عمران کے والد نے عمران کی یہ خواہش پوری کردی۔ بیٹ کا سائز(Size) دیکھ کر عمران کی ہنسی چھوٹ گئی۔ انہوں نے اپنے والد سے کہا۔ "آغا جان یہ تو بہت چھوٹا بیٹ ہے۔ آپ بڑا بیٹ لاتے۔" عمران کی یہ بات سن کر ان کے والد مسکرا دیئے بیٹ عمران کی عمر کے لحاظ سے چھوٹا نہیں تھا۔ مگر وہ بڑا بیٹ چاہتے تھے کیوں کہ عمران اپنے آپ کو چھوٹا تصور نہیں کرتے تھے۔ عمران بچپن ہی

سے خوبصورت لباس کے شوقین تھے۔ وہ بچپن ہی سے بنے ٹھنے رہتے تھے۔

اکلوتا لڑکا ہونے کے باعث عمران کو بھائی کی کمی قدرتی طور پر بہت محسوس ہوتی تھی۔ بھائی کی کمی کو عمران نے اس طرح پورا کیا کہ بہنوں کو بولنگ بیٹنگ اور فیلڈنگ سکھادی اور ان کے ساتھ کرکٹ کھیلنا شروع کردی۔

بچپن میں عمران کو چٹ پٹے کھانے' کھانے کا بہت شوق تھا۔ ان کے والد اکثر انہیں گول گپے کھلانے چڑیا گھر لے جایا کرتے۔ بچپن میں عمران کو آئس کریم بھی بہت پسند تھی۔ وہ اکثر اپنی بہنوں سے ان کے حصے کی آئس کریم بھی لے کر کھالیتے تھے۔

عمران کی عمر جب ساڑھے تین سال کی تھی تب ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ ان دنوں عمران کے والد محترم کی پوسٹنگ ملتان میں تھی ایک دن عمران کھیلتے ہوئے اچانک گھر واپس آگئے۔ ان کے والد انہیں دیکھتے ہی سمجھ گئے کہ کچھ گڑ بڑ ہے۔ کیونکہ خلاف معمول وہ چپ چپ سے تھے۔ بغور دیکھنے پر عمران کے والد نے محسوس کیا کہ عمران کسی سے لڑ کر آئے ہیں۔ کیوں کہ ان کے چہرے پر ناخنوں کے نشان بھی تھے ان کے والد کو تحقیق کرنے پر پتا چلا کہ عمران اپنی ہم عمر ایک جرمن لڑکی کے ساتھ کھیل رہے تھے کہ کسی بچے نے اس لڑکی کی پٹائی کردی۔ عمران چونکہ اس بچی کے ساتھ مانوس تھے اس لئے اس کی پٹائی کا منظر برداشت نہ کرسکے اور فوراً" لڑائی کرنے لگے جس کے نتیجے میں ان کے چہرے پر ناخنوں کی خراشیں آگئیں۔ جن دنوں عمران کے والد صاحب کی پوسٹنگ بہاولپور میں تھی۔ تب اس واقعہ سے ملتا جلتا ایک اور واقعہ پیش آیا۔

عمران بہاولپور میں صادق پبلک اسکول میں تعلیم حاصل کررہے تھے۔ ایک دن ان کے گھر میں سب بچے سیڑھیوں سے چھلانگیں لگا رہے تھے۔ عمران نے یہ منظر دیکھا تو رعب ڈالنے کے لئے بولے "سیڑھیوں سے چھلانگ لگانا کیا کمال ہے اصل کمال تو چھت سے چھلانگ لگانا ہے اور میں یہ کرکے دکھاتا ہوں" یہ کہہ کر وہ بھاگ کر چھت پر چڑھے اور آخری سیڑھی سے چھلانگ لگادی۔ اس کمال کا انجام یہ ہوا کہ عمران کا بازو ٹوٹ گیا' جس کے نتیجے میں عمران کو ہسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ ایک دن عمران سوئے ہوئے تھے۔ ان کے والد اور والدہ پاس بیٹھی ہوئی تھیں کہ ایک نرس آئی اور اس نے سوئے ہوئے عمران کو انجکشن لگا دیا۔ انجکشن لگا کر وہ عمران کے والدین کی طرف مڑی اور مسکراتے ہوئے بولی

"What a sweet child" ابھی یہ جملہ اس
نے ادا ہی کیا تھا کہ ایک زناٹے دار تھپڑ اس
کے منہ پر پڑا۔ انجکشن کی تکلیف سے سویا ہوا
عمران بیدار ہو گیا تھا۔ کوئی بھی بچہ انجکشن کو
پسند نہیں کرتا عمران کو بھی اس پر غصہ آگیا۔
اور اس نے نرس کو تھپڑ جڑ دیا۔ اس تھپڑ نے
نرس کو غصہ سے بھر دیا۔ عمران کے والدین کی
موجودگی کے باعث وہ کچھ نہ کر سکی ورنہ وہ
یقیناً" تھپڑ کے جواب میں کوئی مناسب قدم
اٹھاتی۔

عمران میں صاف گوئی اور جرأت مندی
کے آثار بچپن ہی سے تھے ڈپلومیسی اور بزدلی
کبھی بھی عمران کی طبیعت میں راہ نہ پا سکی وہ
بے حد کھرے اور احساس کمتری سے مُبّرا رہے
ہیں۔ ملتان ہی کا ایک واقعہ ہے۔ گرمیوں کی
تپتی ہوئی حبس زدہ شام کو کچھ مہمان عمران
کے گھر آئے۔ کھلی فضا میں بیٹھنے کا سب کا دل
چاہ رہا تھا۔ سو سب لوگ لان میں بیٹھ گئے۔
ایسے موسم میں شربت ہی سے سب کی تواضع
کی جاتی ہے سو سب لوگوں کے ہاتھ میں
شربت کے گلاس تھے۔ اچانک عمران وہاں
آگئے پسینے سے شرابور وہ اطمینان سے ایک
مہمان کے پاس آکر رک گئے۔ نہایت بے
تکلفی سے اس سے شربت کا گلاس لیا۔ اور

اس سے قبل کوئی کچھ سمجھ پاتا کہ وہ کیا کرنا چاہ رہے ہیں۔ غٹاغٹ سارا شربت پی لیا۔ اور پھر یہ جا وہ جا۔ عمران جب ذرا بڑے ہوئے تو انہیں کہانیاں سننے کا شوق ہو گیا۔ وہ روز اپنے والد سے کہانیاں سنانے کی ضد کرتے اور ان کے والد ہر دفعہ ان کو شیروں اور چیتوں کی کہانیاں تھوڑی بہت تبدیلیاں کر کے سناتے۔ عمران کے ذہن پر ان کہانیوں کا بڑا اثر پڑا ان کے والد کہتے ہیں کہ "ایک دن میں اپنے کمرے میں سو رہا تھا کہ مجھے کھڑکی کے پاس کھٹ پٹ کی آواز آئی جس سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے دیکھا کہ عمران اور ان کے دوست بیٹھے کھسر پھسر کر رہے ہیں مجھے دلچسپی پیدا ہوئی میں کان لگا کر ان بچوں کی کھسر پھسر سننے لگا۔ گفتگو کا موضوع کے تھا "والد صاحب کی بہادری" سب بچے اپنے اپنے والد کی بہادری کے قصے سینے تان کر سنا رہے تھے۔ میں بے حد مضطرب تھا کہ عمران اپنی باری میں کیا سناتا ہے؟ جب عمران کی باری آئی تو وہ کہنے لگا کہ "ایک دفعہ آغا جان کہیں جا رہے تھے۔ اچانک ایک شیر بر آمد ہوا اس نے آغاجان کی راہ روک لی آغا جان نے ہاتھ بڑھا کر شیر کی گردن دبوچ لی پھر اتنی زور سے اس کی گردن دبائی کہ اس کی گردن ٹوٹ گئی۔ بس میرے آغاجان شیر اس طرح ہلاک کرتے ہیں۔"

دوسروں کو کمانڈ کرنے کی خواہش اور صلاحیت عمران میں شروع ہی سے تھی۔ ایک دفعہ ان کے والد شہر سے باہر کہیں جا رہے تھے۔ انہوں نے عمران سے کہا "کہ میں تھوڑے دنوں کے لئے کہیں جا رہا ہوں میرے بعد تمہیں گھر اور اپنی بہنوں کا خیال رکھنا ہے۔ عمران نے اپنے والد کی یہ بات سنتے ہی کہا۔

"اچھا آغا جان" اور پھر ان کے تیور اچانک یکسر تبدیل ہو گئے۔ پانچ چھ سالہ عمران نے اپنی ننھی سے انگلی اٹھائی اور بڑے رعب سے جوان لڑکے کی مانند بہنوں کو اندر چلنے کی تلقین کی اور ان کے پیچھے اس انداز سے چلتے ہوئے گئے جیسے ان کے کندھوں پر ذمہ داریوں کا بڑا بوجھ پڑ گیا ہے۔ عمران کے والد دوپہر کو آرام کرنے کے عادی تھے۔ ایک روز وہ دفتر سے واپس آئے تو عمران کی والدہ نے شکایت کی کہ عمران اس چلچلاتی دھوپ میں سارا وقت باہر کھیلتا رہتا ہے۔ اس طرح اس کے بیمار پڑنے کا خدشہ ہے۔ یہ سن کر وہ عمران کو زبردستی اپنے کمرے میں سلانے کے لئے لے گئے کچھ دیر بعد وہ خود تو سو گئے مگر عمران جاگتے رہے۔ وہ بستر سے اترے اور باہر جاتے ہوئے اپنی

والدہ سے کہنے لگے۔
"امی میں آغا جان کو سلا آیا ہوں"۔
عمران کے والد کہتے ہیں ایک دفعہ ہمارے گھر کے قریب ایک پولیس آفیسر کے گھر چوری ہو گئی پولیس تفتیش کرنے روزانہ آتی تھی۔ ان دنوں عمران نے خلاف معمول کھانا کھانا بند کردیا عمران کی والدہ کو اس سے تشویش محسوس ہوئی۔ انہوں نے مجھ سے شکایت کی کہ عمران آج کل بالکل کھانا نہیں کھا رہا میں نے اس بابت عمران سے پوچھا اس کا نہایت دلچسپ جواب یوں تھا۔
"آغا جان آج کل بہت مزا آ رہا ہے۔ پولیس آفیسر کے گھر چوری کی وجہ سے پولیس تفتیش کرنے آتی ہے اور جو بھی بیچارا چھابڑی والا آتا ہے پولیس اسے گھیر لیتی ہے اور اس سے چیزیں لے کر خود بھی کھاتی ہے اور ساتھ میں' میں اور دوسرے بچے بھی کھاتے ہیں۔"
عمران کے کردار کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ بالکل بھی فضول خرچ نہیں ہیں بلکہ بچپن ہی سے اسے ناپسندیدگی سے دیکھتے تھے۔ ایک بڑے خاندان کی پارٹی تھی۔ عمران اس میں گئے واپسی پر ان کے والد نے پوچھا "کیوں بیٹے پارٹی کیسی رہی"
"بے حد بور"۔ یہ عمران کا جواب تھا۔ عمران نے کہا کہ سب لوگ وہاں بوتلیں ادھر ادھر پھینک رہے تھے۔ گھاس پر بوتلیں لڑھک رہی تھیں اور پیسٹریاں بھی پیروں تلے روندی جا رہی تھیں یہ سب مجھے بہت برا لگ رہا تھا۔ آغا جان کتنے ہی لوگ ایسے ہیں جنہیں یہ سب میسّر نہیں ہے اور ادھر یہ لوگ ہیں جو ان سے کھیل رہے تھے۔ عمران پڑھائی میں اوسط درجے کے تھے۔ ان کے والد کو کرکٹ کے کھیل سے قطعی دلچسپی نہیں تھی مگر وہ عمران پر کبھی دباؤ بھی نہیں ڈالتے تھے کہ پڑھو' ہر وقت پڑھا کرو۔
ایک بیٹے کے طور پر عمران ہمیشہ فرمانبردار رہے ہیں انہوں نے ہمیشہ والدین کی بے حد عزت کی ہے۔ عمران کو اپنی والدہ کے ساتھ بے حد پیار تھا۔ ماں کے ساتھ ان کی جذباتی وابستگی بے حد گہری تھی' حالانکہ ماں عمران کو اکثر ڈانٹتی تھیں مگر عمران مسکرا کر ڈانٹ سنتے تھے ماں کے آگے وہ کبھی نہیں بولتے تھے۔ جب عمران کی والدہ کا انتقال ہوا تب عمران حد درجہ رنجیدہ تھے۔ اپنی والدہ کی ہی یاد میں عمران نے کینسر اسپتال بنایا۔
یہ تھے عمران خان کے بچپن کے چند واقعات جو یقیناً" آپ لوگوں کو پسند آئے ہوں گے۔

انگلش چمگادڑیں..

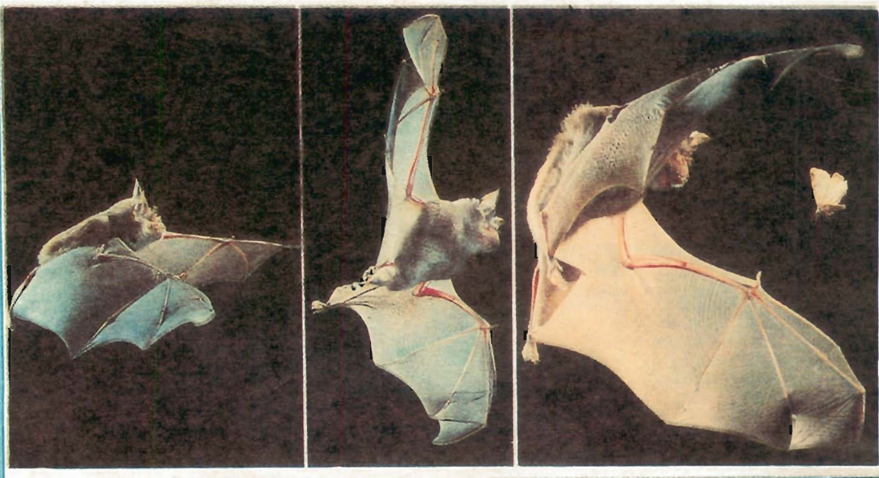

انگوٹھے کے برابر ننھی چمگادڑ

برطانیہ کی بھیانک چمگادڑ

چمگادڑوں کی نحوست کے بارے میں عجیب عجیب قصّے ... مشہور ہیں اور جہاں اور جب موقع ملتا ہے انسان اسے مارڈالنے سے بھی نہیں چوکتا۔ انسان کی اسی عادت کی وجہ سے اکثر جانوروں کی نسلیں ناپید ہوگئی ہیں۔ برطانیہ میں چمگادڑوں پر تحقیق کے بعد انہیں بے ضرر قرار دے دیا گیا ہے اور اب بعض ادارے باقاعدہ ان کو نسل کشی سے بچانے کے لیے کام کررہے ہیں....

چمگادڑوں کا دارالامان

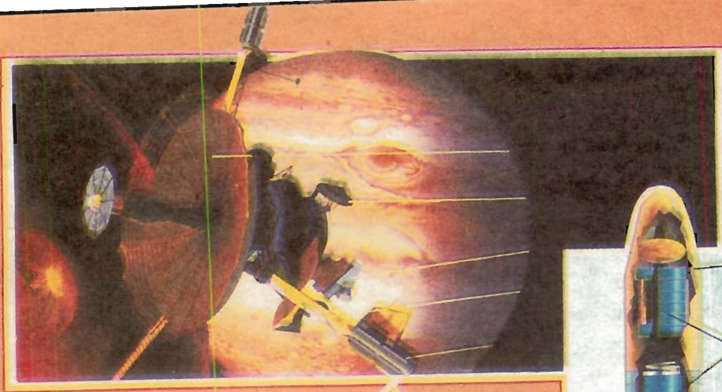

خلائی تسخیر

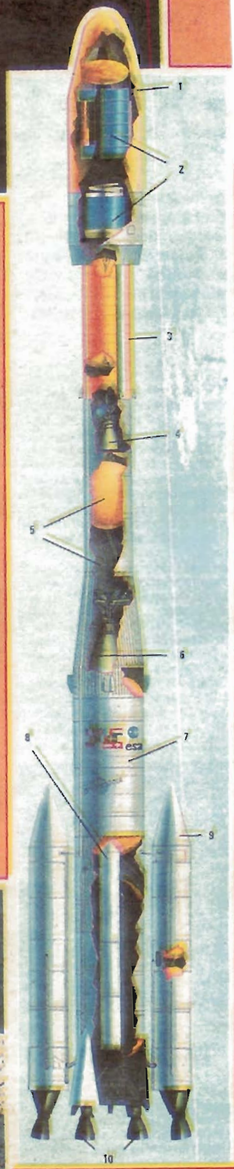

قرۃ العین طاہر

پچھلے مہینے ہم نے چاند پر انسانوں کے آباد ہونے کے بارے میں دل چسپ فیچر شائع کیا تھا اس بار ہم آپ کو مختصراً چاند تک پہنچنے کی کہانی سنا رہے ہیں۔

انسان چاند اور ستاروں کو فتح کرنے کے خواب تو صدیوں سے دیکھ رہا تھا لیکن اس خواب کی تعبیر کا صحیح معنوں میں وقت ۱۹۵۰ء کے بعد آیا۔ اسی لئے اس کے بعد کے دور کو "خلائی دور" کہا جاتا ہے۔ اس سال یعنی ۱۹۵۰ء میں نہایت طاقت ور انجنوں والے طیارے خلاء کی سرحدوں کو چھُو آئے تھے لیکن اکتوبر ۱۹۵۷ء میں اس میدان میں سب سے بڑی کامیابی نصیب ہوئی جب روس نے مصنوعی سیارہ اسپوتنک خلاء میں بھیج دیا۔ اس کے بعد ہی خلاء میں تجرباتی طور پر جانوروں کو بھیجنے کے سلسلے کا آغاز ہوا۔ اب ذرا آپ سوچیئے کہ یہ جانور مثلاً بندر اور کتے وغیرہ جب خلاء میں پہنچتے ہوں گے تو کیسا محسوس کرتے ہوں گے۔ خلاء میں پہنچ کر جب کوئی کتا وحشت سے بھونکتا ہوگا تو کیسا لگتا ہوگا۔ جانوروں کی خلاء سے بحفاظت واپسی سے انسان کو ہمت ہوئی کہ وہ خود بھی خلاء میں قدم رکھنے کی جرأت کرے۔ اس میدان میں بھی سبقت روس ہی کو حاصل ہوئی، جب ۱۲ اپریل ۱۹۶۱ء کو روسی خلاء باز یوری گاگرین زمینی حدود سے نکل کر خلاء میں داخل ہوا۔ پیدل نہیں، خلائی گاڑی پر، جس کا نام تھا وسٹوک 1۔ روسیوں کی یہ کامیابی امریکیوں کے لئے تشویش کا باعث ہوئی۔ کیونکہ امریکہ کافی عرصے سے خلائی تحقیق میں مصروف تھا لیکن ابھی تک اس میدان میں اس نے کوئی بڑا کارنامہ انجام نہیں دیا تھا۔ روسی خلا بازوں کی کامیابی کے بعد امریکہ نے بھی بڑی جدوجہد سے اسی سال یعنی ۱۹۶۱ء میں اپنے خلا باز خلا میں پہنچا دیے۔ بس پھر کیا تھا۔ روس اور امریکہ کے درمیان چاند پر پہنچنے کے لئے ایک لمبی دوڑ کا آغاز ہوا۔ چاند پر پہنچنے میں تب کوئی لمبی چوڑی دشواریاں حائل نہیں تھیں۔ اصل میں یہ پتا نہیں چل رہا تھا کہ چاند پر پہنچ کر انسان کے جسم کی کیا حالت ہوگی؟ کیا وہ وہاں کے ماحول اور موسم کو برداشت کرپائے گا یا نہیں؟ چنانچہ یہ جاننے کے لئے چاند پر خلائی راکٹ بھیجے گئے جنھوں نے نہایت قریب سے چاند کی سطح کی تصویریں اتاریں۔ ان تجربات سے یہ نتیجہ نکلا کہ اگر ضروری سہولتیں فراہم کردی جائیں تو انسانی جسم نہایت عمدگی سے وہاں کے ماحول میں ٹھیک ٹھاک رہ سکتا ہے۔

لیجئے - روس پھر جیت گیا۔ مارچ ۱۹۶۵ء میں روسی خلانورد الیکزئی لیونوف وہ پہلا آدمی تھا

جس نے خلا میں چہل قدمی کا تاریخی کارنامہ سرانجام دیا۔ پھر روس ہی نے چاند کی سطح کی تصویریں کھینچنے میں بھی پہل کرلی۔ غالباً" اس کی یہ کامیابیاں امریکہ کے لئے ناقابلِ برداشت ہوچکی تھیں۔ چنانچہ چاند کو تسخیر کرنے کا اعلان کردیا' اسی نے اپنا یہ عزم کیا کہ دس سال سے پہلے پہلے اس کے خلانورد چاند کی سطح پر اترنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔ اس وقت تک ایسا لگ رہا تھا کہ روس ایک بار پھر اس دوڑ میں امریکہ سے آگے نکل جائے گا۔ اور شاید یہی خوف تھا جس کی بنا پر امریکہ نے اپنے منصوبے پر عمل کرنے میں جلدی کی اور اپنے اپالو چاند کی سمت بھیجنے شروع کیے۔

آخر کار ۲۰ جولائی ۱۹۷۹ء کو انسانی تاریخ کا وہ عظیم الشان، عقل کو حیران کردینے والا واقعہ پیش آہی گیا' جس پر انسان جب بھی سوچے گا' اپنے انسان ہونے پر فخر کرے گا۔ امریکہ کے اپالو ۱۱ کو چاند کی سطح پر اترنے میں کامیابی حاصل ہوگئی۔ خلانورد نیل آر م اسٹرانگ اور ایڈون ایلڈرن وہ پہلے انسان تھے جنھوں نے چاند کی سطح پر پہلی بار قدم رکھا۔ چار روز بعد وہ صحیح سلامت واپس آگئے۔ بلاشبہ وہ ایک ہیرو کی طرح واپس آئے تھے۔ وہ اپنے ساتھ چاند کی سطح پر پائی جانے والی چٹانوں کے ٹکڑوں کے نمونے بھی لائے تھے جنہیں سائنس دانوں نے اپنی تحقیق کا موضوع بنالیا۔

اسی سال یعنی نومبر ۱۹۷۹ء میں روس نے جو امریکہ کے چاند پر پہنچ جانے سے سخت زخم خوردہ تھا' دعویٰ کیا کہ چاند کی سطح سے چٹانوں کے جو ٹکڑے امریکی خلانورد لے کر آئے ہیں' انہیں لانا کوئی ایسا بڑا کارنامہ نہیں۔ کیونکہ ان ٹکڑوں کو لانے کے لئے ایسے خلائی جہاز بھی بہت کافی ہیں جن میں انسان نہ ہوں۔ چنانچہ روس نے اس دعوے کے ساتھ ہی ایک ایسا خلائی جہاز لونو کوڈا کے نام سے چاند کی طرف روانہ کردیا۔ دسمبر ۱۹۷۰ء میں اس نے زہرہ پر کمند ڈالی۔ لیکن افسوس کہ خلائی دوڑ میں امریکہ کو ایک بار پھر پیچھے چھوڑنے سے پہلے ہی روس ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگیا۔ دیکھئے دوسرے سیاروں کو فتح کرنے کا خواب کب پورا ہوتا ہے۔ ☆

اعلان

جناب اصغر علی ساگر! جون ۹۵ء کے شمارے میں آپ کی تحریر "شامت کا مارا" کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ آپ نے تحریر کے ساتھ اپنا پتا نہیں لکھا۔ براہِ کرم جلد از جلد اپنا مکمل پتا ہمیں ارسال کیجئے تاکہ آپ کا اعزازی شمارہ اور اعزازیہ آپ کو روانہ کیا جاسکے۔ (ادارہ)

کامیابی مبارک

اپنی کامیابی سے

ہمیں بھی باخبر کیجئے

آپ کسی بھی کلاس
کے طالب علم ہوں ... اگر آپ نے کلاس میں
پہلی پوزیشن
دوسری پوزیشن
یا
تیسری پوزیشن
حاصل کی ہے تو اس کی تصدیق اپنے تعلیمی
ادارے کے سربراہ سے کروائیے اور ہمیں
بھجوا دیجئے؛
ہم آپ کو

پرائڈ آف پوزیشن

کی سند دیں گے

تحریکِ فروغِ علم میں پیش پیش

ماہنامہ
آنکھ مچولی
1- پی آئی بی کالونی، کراچی 5

پیٹ کے امراض کیلئے مفید ہے
قبض کشا اور مقوی ہے گلے کی خرابی
میں بھی مفید ہے۔

احمد کا
گلقند آفتابی

لطیف مرکب
مہکتی طاقت

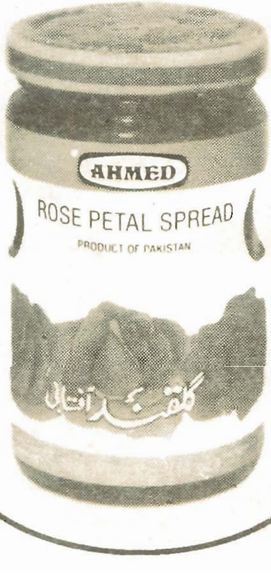

بارش کی دعا

معین تابش

کیا بتائیں کس طرح گزرا مہینہ جون کا
اتنی گرمی ہے کہ پانی بن گیا ہے خون کا

دھوپ اتنی ہے کہ سایہ بھی نہیں ہے نام کو
راہ چلتے لوگ بیٹھیں گے کہاں آرام کو

ہو رہا ہے جسم سے خارج پسینہ اس طرح
ٹوٹ جاتا ہے کہیں سے بند پانی جس طرح

آنچ دیتی ہیں ہوائیں گرم شعلوں کی طرح
حلق میں کانٹے اُگے بنجر زمینوں کی طرح

اتنی گرمی کہ شہر کی ہر سڑک ویران ہے
قریہ قریہ، کوچہ کوچہ جیسے اک شمشان[1] ہے

اے خداوند دو عالم قادرِ مطلق ہے تو
ہر قدم پر ہے ہمیں تیرے کرم کی آرزو

دھوپ کے مارے ہوئے ہیں ابرِ رحمت بھیج دے
ایسی بارش جو ہو وجہ خیر و برکت بھیج دے

[1]: وہ جگہ جہاں ہندو اپنے مُردے جلاتے ہیں۔

مستقبل کا خوف

قرۃ العین

"رمشا پرچے کیسے ہو رہے ہیں؟ کچھ امید ہے پوزیشن آنے کی۔" صوما نے اس کے قریب آتے ہوئے پوچھا۔

"فرسٹ کلاس ہو رہے ہیں۔ پہلی نہیں تو انشاء اللہ دوسری یا تیسری پوزیشن تو آ ہی جائے گی۔ تم اپنی سناؤ۔" رمشا نے جواب دیا۔

"میرے خیال میں تو اچھے ہو رہے ہیں اب آگے دیکھو کیا ہوتا ہے۔ تم سے مقابلہ ہے نا اس لئے ڈر لگتا ہے۔" صوما نے مزاحیہ انداز میں کہا اور دونوں سہیلیاں ہنس پڑیں۔

○

دراصل آج کل میٹرک کے امتحان ہو رہے تھے۔ بورڈ میں اب کے مقابلہ سخت تھا۔ ایک طرف کیڈٹ کالج کوہاٹ' دوسری طرف گورنمنٹ اسکول' تو تیسری طرف یونیورسٹی ماڈل اسکول۔ ان تینوں میں یونیورسٹی ماڈل اسکول کا

پلڑا بھاری تھا۔ ان کے اسکول کی لڑکیاں ہر سال ایک پوزیشن تو ضرور ہی لیتی تھیں اور میرٹ لسٹ میں بھی اس اسکول کی لڑکیوں کی تعداد زیادہ ہوتی تھی۔ اس دفعہ بھی میڈم الماس نے وہم کی ذہین لڑکیوں کو بلا کر محنت کی تلقین کی تھی' خاص طور پر صوما اور رمشا کو۔ دونوں میں خدا نے خاصی ذہانت بھر دی تھی۔ اور ٹیچرز کی امیدیں بھی ان سے لگی تھیں۔

○

خدا خدا کر کے امتحانات ختم ہوئے اور پانچ مہینے کی چھٹیاں ہو گئیں۔ رمشا کی چھٹیاں تو یوں غارت ہو گئیں کہ اس کا ایک ایک دن گن کر گزر رہا تھا۔ آخر نتائج کے اعلان کا دن آ ہی گیا۔

چھ بجے کی مقامی خبریں سننے کے لئے رمشا نے ٹی وی کھولا تو وہ ٹھٹک گئی بورڈ کے نتائج کی خبر سنائی جا رہی تھی۔

پہلی پوزیشن پر وہ اچھل پڑی وہ بلا شک و شبہ صوما ہی کی تھی۔ "دوسری پوزیشن یقیناً" میری ہی ہو گی۔" لیکن اس کی امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ وہ نہ سیکنڈ آئی نہ تھرڈ۔ "چلو خیر میرٹ لسٹ میں تو نام آ ہی جائے گا۔" وہ بوجھل قدموں سے یہی سوچتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

دوسرے دن اس کے ابو گزٹ لے آئے میرٹ لسٹ میں اس کا نام تو تھا لیکن بہت نیچے۔

اور جب اس کی مارکس شیٹ آئی تو اس پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "انگلش میں میرے اتنے کم مارکس ہو ہی نہیں سکتے۔ یہ ممکن ہی نہیں۔" انگلش میں اس کے نمبر ہمیشہ بہت زیادہ ہوا کرتے تھے اور اب پورے ۱۵۰ میں سے صرف ۹۸۔ اس کا پیپر بہت اچھا ہوا تھا' لیکن یہ نمبر۔۔۔۔۔۔

"بیٹا اگر تم انگلش کا پیپر اچھا کرتیں تو یقیناً" اچھے نمبر لے ہی لیتیں۔" ابو نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"ابو میں نے تو پیپر بہت اچھا کیا تھا۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ میں اتنے کم مارکس لوں انگلش میں مجھے بہت نمبر آنے کی توقع تھی۔" وہ روہانسی ہو رہی تھی۔ "ابو آپ پلیز میرے انگلش کے پیپر کے دونوں پارٹس دوبارہ چیک کروائیں۔ کچھ گڑبڑ تو ضرور ہوئی ہے۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔

"لیکن بیٹا۔۔۔۔۔۔" ابو کچھ ہچکچائے۔

"نہیں ابو آپ کو دونوں پارٹس چیک کروانے ہوں گے۔"

"ٹھیک ہے' یہ بھی کر کے دیکھ لیں گے۔"

○

کنٹرولر امتحانات سے بات کرنا' پیسے جمع کرنا' ان تمام کاموں میں بہت سے دن لگ گئے۔ وہ تو

کنٹرولر صاحب سے تھوڑی بہت جان پہچان کہیں سے نکل آئی تھی' ورنہ شاید اور دیر ہو جاتی۔ رمشا خود گئی تھی ابو کے ساتھ۔ اسے کامل یقین تھا کہ اتنے کم مارکس نہیں ہو سکتے۔

پارٹ ون چیک کر کے کنٹرولر نے اسے اطمینان سے میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ "بی بی اِس میں تو کوئی غلطی نہیں اب دعا کیجئے پارٹ۔ ٹو میں ہی کوئی غلطی نکل آئے۔"

اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا لیکن کچھ ہی دیر بعد اس کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا' جب اس نے کنٹرولر کو پارٹ۔ ٹو کے نمبروں میں ردو بدل کرتے ہوئے دیکھا۔

"لیجئے خدا نے آپ کی سن لی۔ پورے ۳۴ نمبروں کا فرق ہے۔ شاید گنتی میں رہ گئے تھے کل نمبروں میں جمع نہیں ہو سکے خوش ہو جائیں۔" انہوں نے کہا۔

"خوش تو میں جب ہوں گی جب مجھے میری اصل پوزیشن ملے گی۔" وہ دل ہی دل میں بولی۔

نمبروں کا حساب لگایا تو وہ سیکنڈ تھی۔ وہ تو خوشی سے پاگل ہونے لگی۔

○

اسے گھر چھوڑنے کے بعد اس کے ابو واپس بورڈ آفس چلے گئے تاکہ وہاں بورڈ کے چیئرمین سے بات کر کے اس کی دوسری پوزیشن کا اعلان کیا جا سکے۔

گھر بھر میں جشن کا سا سماں تھا۔ اسے تو اس بات کی خوشی تھی کہ یونیورسٹی ماڈل اسکول پھر بازی لے جائے گا۔ لیکن شاید قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ابو گھر آئے تو کچھ بجھے بجھے سے تھے۔ رمشا کا ننھا دل کسی انجانے خوف سے کانپنے لگا۔ وہ سوالیہ نظروں سے ابو کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"انہوں نے تمہیں سیکنڈ ڈکلیئر کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ رزلٹ آؤٹ کر چکے ہیں اور اب یہ ناممکن ہے۔" ابو نے افسردہ لہجے میں کہا۔

"لیکن ابو یہ تو میرا حق ہے مجھے میری محنت کا پھل تو ملنا چاہئے۔ اور پھر غلطی ان کی ہے میری نہیں۔" وہ تقریباً" چیخ ہی پڑی تھی۔

"غلطی نہیں------شاید انہوں نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے۔ بعض ممتحن اپنے چہیتوں کو پوزیشن دلوانا چاہتے ہیں--------یہ چہیتے یا تو ان کے رشتہ دار ہوتے ہیں یا پھر رشوت اپنا کام دکھاتی ہے----------وہاں تو پورے کے پورے پرچے اُدل بدل ہو جاتے ہیں۔ تمہارے تو صرف نمبر ہی گننے سے رہ گئے تھے۔" ابو نے کہا۔

"ابو اب کیا ہو گا۔" رمشا نے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں بس صبر کرنا ہو گا۔" ابو

بولے۔

○

"کیوں اتنی خفا ہو تم تو سیکنڈ آئی ہو۔" رمیصا اس کی دوست جو اس کی کامیابی کی خبر سن کر آئی تھی اسے یوں پژمردہ دیکھ کر بولی۔

"بورڈ نے مجھے سیکنڈ ڈکلیئر کرنے سے انکار کردیا ہے اِن کا کہنا ہے کہ رزلٹ آؤٹ ہونے کی صورت میں اب ہم کچھ نہیں کرسکتے۔" وہ بولی۔

"ایک ترکیب ہے۔ تم ایسا کرو ابو سے کہہ کر بورڈ پر مقدمہ کروا دو۔ میرے پاپا کے پاس پہلے بھی ایسا کیس آیا تھا اور جیت بھی ان ہی کی ہوئی تھی۔" رمیصا کے ابو وکیل تھے۔

"کیا واقعی ایسا ہو سکتا ہے؟۔" رمشا کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔

"ہاں واقعی۔ بس تم ابو سے بات کرکے مجھے فون کردینا۔ میں منتظر رہوں گی۔ رمیصا جاتے جاتے بولی۔

"ٹھیک ہے خدا حافظ۔" رمشا نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔

○

"ہیلو کیسی ہو رمشا ؟ " دوسری طرف رمیصا ہی تھی۔

"ٹھیک ہوں۔" رمشا نے کہا۔

"ہاں اب بتاؤ ابو سے بات کی؟ کیا کہا انہوں نے۔" رمیصا بے تابی سے بولی۔

"وہ رضامند نہیں ہوئے۔" رمشا کی آواز ریسیور سے ابھری۔

"مگر کیوں؟" رمیصا نے پوچھا۔

رمشا کچھ دیر خاموش رہی پھر بولی۔"ابو نے اپنے دوست سے مشورہ کیا تھا۔ وہ بھی محکمہ تعلیم میں افسر ہیں۔ "ان کا کہنا ہے کہ ہم ایسی کوئی کارُوائی نہ کریں۔"

"مگر کیوں۔۔۔۔۔۔۔کیا ہم مقدمہ ہار جائیں گے ؟"

"نہیں جیت تو ہماری ہی ہوگی۔۔۔۔۔۔۔۔مگر۔۔۔۔۔۔۔"

"مگر کیا؟"

"مگر یہ کہ یہ میرے مستقبل کا سوال ہے۔ آخر مجھے کل پھر ایف ایس سی کا امتحان دینا ہے۔۔۔۔۔۔۔اور میرے پیپر پھر انہیں لوگوں کے پاس جائیں گے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ رمیصا انہیں کسی کے جذبات یا کسی کے مستقبل سے کیا۔۔۔۔۔۔۔۔وہ تو اپنی سبکی کا انتقام لے لیں گے۔۔۔۔۔۔۔وہ پھر میرے نمبر کاٹ لیں گے۔۔۔۔۔۔۔اور میں بار بار اس عذاب سے نہیں گزر سکتی۔" اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

مرزا محمد رفیع سودا

ڈاکٹر اسلم فرخی

یہ بات اب سے کوئی ڈھائی تین سو برس پہلے کی ہے۔دلی میں ایک سوداگر تھے۔ مرزا محمد شفیع نام تھا۔اچھا کاروبار تھا،شہر میں عزت تھی۔ مال دار آدمی سمجھے جاتے تھے۔ ایک ہی بیٹا تھا۔ مرزا محمد رفیع۔ بڑا تیز طرار ہنسنے ہنسانے والا۔ مرزا محمد شفیع مرگئے تو سارا مال اسباب، تجارت سب مرزا محمد رفیع کے حصہ میں آیا۔ بیٹے نے باپ کی جمع پونجی دونوں ہاتھوں سے لٹائی۔ دوست احباب مزے کرنے لگے۔ کچھ دن سب نے خوب عیش کیا۔گانا بجانا،ناچ رنگ سب کچھ ہوا۔ دولت کو پر لگ گئے۔ساری جمع جتھا ختم ہوگئی۔دوست احباب ساتھ چھوڑ گئے۔ مصیبت میں کون کس کا ساتھ دیتا ہے۔مرزا محمد رفیع بالکل اکیلے رہ گئے۔ پیسہ پاس نہیں، ہنر کوئی آتا نہیں،کریں تو کیا۔ فارسی میں شعر کہا کرتے تھے۔ ایک دن ایک استاد نے سمجھایا۔ ”میاں مرزا رفیع فارسی تمہاری زبان نہیں۔ اردو میں شعر کہا کرو۔ یہ بات مرزا رفیع کی سمجھ میں بھی آگئی۔ اردو میں شعر کہنے لگے اور اس کے ذریعے سے امیروں کے مصاحب ہوگئے۔آدمی بڑے سلیقے کے تھے،اس وجہ سے امیر امرا میں بڑی قدر ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کی شاعری کا رنگ بھی جم گیا۔

دلی میں ایک درویش تھے۔وہ مرزا محمد رفیع پر بڑی شفقت کرتے تھے۔ باپ مرے تو انہوں نے مرزا سے پوچھا کیا چاہتے ہو؟ مرزا نے کہا۔ ”اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔یہ چاہتا ہوں کہ شعر شاعری میں نام ہو جائے۔“ درویش مسکرائے۔بولے ”انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔ تم سودا ہو“ مرزا محمد رفیع نے اس دن سے اپنا تخلص (چھوٹا سا نام جو شاعر اپنے لئے خود پسند کر لیتا ہے) سودا رکھ لیا اور وہ ہر جگہ ہر محفل میں مرزا سودا پکارے جانے لگے۔ دلی کے

شاعروں میں انہیں بڑی شہرت حاصل ہوئی استاد سمجھے جانے لگے۔ اس زمانے کے شاعر غزلیں لکھتے تھے، قصیدے لکھتے تھے، ہجویں لکھتے تھے۔ مثنوی اور مرثیے لکھتے تھے۔ قصیدہ ایک لمبی نظم ہوتی ہے جس میں کسی امیر، سردار یا بادشاہ کی تعریف کی جاتی ہے۔ برائی بھی ہو سکتی ہے۔ برائی کو ہجو کہتے تھے۔سودا تعریف اور برائی دونوں کے بادشاہ تھے تعریفی قصیدہ ایسا لکھتے تھے کہ جو سنتا خوش ہو جاتا اور ہجو میں ایسا انداز اختیار کرتے تھے کہ سننے والوں کے پیٹ میں بل پڑجاتے تھے۔ مرثیہ اس زمانے میں ابتدائی حالت میں تھا۔ سودا نے مرثیے بھی ایسے لکھے کہ سن کر دلوں پر خاص اثر ہوتا تھا۔ استاد تھے، جو کچھ لکھتے تھے کمال کے ساتھ لکھتے تھے۔

یہ اردو زبان اور شاعری کی ترقی کا زمانہ تھا۔ شاعری میں آج کل کی سی صفائی اور سادگی نہیں تھی کیونکہ زبان پوری طرح صاف نہیں ہوئی تھی۔ اس کی تراش خراش ہو رہی تھی۔ شاعر شاعری میں نیا انداز پیدا کر رہے تھے اور اسے خوب صورت بنانے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ سودا نے اس کوشش میں بڑی محنت کی۔ زبان کو صاف کیا، غزل میں خوب صورتی پیدا کی۔ ان کی غزلیں بہت مشہور ہیں۔ لوگ پڑھتے ہیں سر دھنتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ سودا واقعی بڑا شاعر تھا۔ زبردست شاعر تھا۔ نئی نویلی اردو غزل کو فارسی غزل کے مقابلہ پر لے آیا۔

دلی میں سودا مختلف امیروں کے دربار میں رہے۔ ان کی شان میں قصیدے لکھتے رہے۔ انہیں اردو کا سب سے بڑا قصیدہ لکھنے والا شاعر سمجھا جاتا ہے۔ قصیدہ لکھنے والا شاعر تعریف کے سلسلے میں نئے سے نیا مضمون ڈھونڈتا ہے۔ شان دار الفاظ استعمال کرتا ہے۔ شعروں کو سجاتا اور سنوارتا ہے۔ طرح طرح کے منظر پیش کرتا ہے۔ کہیں بہار کا سماں دکھاتا ہے، کہیں باغ کا نقشہ کھینچتا ہے۔ کہیں کوئی خیالی تصویر پیش کرتا ہے، کہیں بات چیت کا رنگ ڈھنگ دکھاتا ہے۔ غرض ہر طرح کی تصویریں دکھاتا چلا جاتا ہے۔ بڑا مشکل کام ہے مگر سودا نے یہ مشکل کام اتنے سلیقے اور خوب صورتی سے کیا کہ وہ اردو کے سب سے بڑے قصیدہ لکھنے والے شاعر مانے گئے۔ بعض امیروں کا نام صرف اس وجہ سے زندہ ہے کہ سودا نے ان کی تعریف میں قصیدہ لکھا ہے۔

سلیقہ تعریف کرنے کے لئے بھی ضروری ہے اور برائی میں بھی سلیقہ سے اثر پیدا ہو جاتا ہے۔ بڑا شاعر اپنے شاعرانہ سلیقے سے برائی کو بھی ہنر بنا دیتا ہے۔ سودا اس فن کے ماہر تھے۔ طبیعت میں بڑی تیزی تھی۔ بلاوجہ کسی سے الجھتے نہیں تھے مگر جو لوگ ان سے الجھتے تھے، ان کی ایسی خبر لیتے کہ دنیا تماشہ دیکھتی۔ پھر ایک بات اور ہے، برائی صرف نفرت ہی کی وجہ سے نہیں ہوتی، خلوص اور

ہمدردی کی وجہ بھی ہوتی ہے۔ چاروں طرف پھیلی ہوئی خرابیوں کو ہنسنے ہنسانے کے انداز میں پیش کر کے شاعر اور ادیب ان خرابیوں پر ہنستے نہیں ہیں۔ بلکہ ہمیں اس کا احساس دِلاتے ہیں۔ سودا کے عہد میں حکومت کمزور ہو گئی تھی۔ چور اچکوں، اٹھائی گیروں کی بن آئی تھی۔ ہر طرف لوٹ مار مچی ہوئی تھی۔ شریف لوگ اپنے گھروں میں بند بیٹھے ہوئے تھے۔ سرکاری نوکروں اور فوجیوں کو تنخواہیں نہیں ملتی تھیں۔ سودا نے یہ حال دیکھ کر ایک ہجویہ نظم لکھی جس میں اس عہد کی حالت کو بڑے دل چسپ انداز سے بیان کیا ہے۔ بالکل آج کل کا سا نقشہ معلوم ہوتا ہے۔ اس قسم کی نظم کو "شہر آشوب" کہتے ہیں۔

دلی میں ایک کوتوال تھا فولاد خاں۔ چوروں کے سامنے بالکل بے بس۔ سودا نے ایسے خوب صورت انداز سے اس کی ہجو کی ہے کہ جو پڑھتا ہے، ہنستا ہے۔ انہوں نے لکھا کہ چوروں سے پریشان ہو کر فولاد خاں نے کوتوالی میں شہر کے سارے چوروں کو جمع کیا اور ان سے کہا۔ "بھائیو تم چوری کرنا چھوڑ دو اگر تمہیں کسی کی کوئی چیز پسند آجائے تو چرانے کے بجائے میرے پاس آکر مجھ سے اس کی قیمت لے جاؤ۔" اس پر ایک چور کھڑا ہوا اور کہنے لگا۔ "مجھے دس روپے دلوائیں۔" کوتوال نے کہا کس بات کے؟" چور بولا۔ "یہ پگڑی جو آپ باندھے ہیں مجھے پسند آگئی ہے۔ کم از کم دس روپے کی ہوگی۔ بس دس روپے مجھے دے دیجئے تاکہ میں یہ پگڑی نہ چراؤں۔" دیکھی آپ نے کوتوال کی بے بسی۔ چوروں کے سامنے کیسا بے بس تھا اور چور کیسے دلیر ہو گئے تھے۔ سودا نے کیسے مزے سے چٹکی لی ہے۔ حالات اتنے خراب ہو گئے ہیں کہ معاملات سدھارنے والے اور امن چین قائم کرنے والے کچھ نہیں کرسکتے۔ بظاہر ہنسنا ہنسانا لیکن اس ہنسی میں قوم کی تباہی اور بربادی پر آنسو بہائے گئے ہیں۔

سودا خرابیوں کے باوجود دلی میں گزر کرتے رہے مگر حالات روز بروز خراب ہوتے گئے۔ نادر شاہ نے حملہ کیا۔ دلی کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ شہر خون میں نہا گیا۔ پھر ابدالی نے حملہ کیا۔ رہی سہی کسر اس نے پوری کردی۔ لوگ دلی چھوڑ چھوڑ کر جانے لگے۔ سودا نے بھی دل پر پتھر رکھ کر دلی کو خدا حافظ کہا۔ وطن سے چل کھڑے ہوئے۔ بنگش نوابوں کی ایک چھوٹی سی ریاست تھی فرخ آباد۔ ریاست کا وزیر مہربان خاں ان کا بڑا قدردان تھا۔ اس کے پاس چلے گئے۔ مہربان خاں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ سودا فرخ آباد میں دس برس تک بڑی عزت آبرو سے رہے۔ خوش رہے۔ یہاں لاہور کا ایک شاعر فدوی ان کے ایک شاگرد سے الجھ گیا اور پھر شاگرد کے ساتھ استاد کو بھی لپیٹ لیا۔ سودا نے اس کی ایسی زبردست ہجو لکھ دی جو آج تک مشہور ہے۔

کہے ہے خلق وہ جاتا ہے الو بنیئے کا
ہر ایک دیکھنے آتا ہے الو بنیئے کا

بنیئے کے الو کی پھبتی فدوی پر ایسی چپکی کہ سب کو یاد ہوگئی۔

فرخ آباد سے سودا اودھ کے دارالحکومت فیض آباد چلے گئے۔ اودھ کے حاکم نواب شجاع الدولہ بھی ان کے بڑے قدردان تھے۔ شجاع الدولہ نے انہیں چھ ہزار روپے سالانہ کی جاگیر عطا کی ۔ سودا یہاں بھی عزت آبرو سے زندگی گزارتے رہے۔ شجاع الدولہ کے بعد آصف الدولہ نواب ہوئے۔ وہ دارالحکومت لکھنؤ لے آئے۔ سودا بھی لکھنؤ آگئے۔ باقی عمر یہیں گزاری۔ فیض آباد میں ایک نامی گرامی شاعر تھے۔ ہنسوڑ۔ مزاحیہ شعر کہتے تھے۔ ضاحک تخلص تھا انہوں نے سودا کی ہجو لکھ دی۔ سودا اپنی طرف سے پہل نہیں کرتے تھے مگر جب حملہ ہوتا تھا تو ایسا سخت جواب دیتے تھے کہ حملہ کرنے والا زندگی بھر کے لئے شرمندہ ہوجاتا تھا۔ میر ضاحک کی ہجو کے جواب میں سودا نے ان کی ایسی ایسی زبردست ہجویں لکھیں جو اردو شاعری میں یادگار ہوگئیں۔ یہ دکھایا کہ ضاحک کو حد سے زیادہ کھانے کی بیماری ہے۔ جہاں جب جو کچھ مل جاتا ہے چٹ کر جاتے ہیں۔ جہاں کہیں سے کھانے کی آواز آتی ہے یہ بے قرار ہو کر اس طرف دوڑتے ہیں۔

گھر میں اب جس کے دیگچہ کھڑکے
در پہ اس کے یہ بیٹھے یوں اڑ کے
گور سے پھر جو رستم اٹھ کر آئے
میت اس کی اٹھائے یا نہ اٹھائے
آگ لگ کر کسی کے گھر سے دود
ایک ذرّہ بھی گر کرے ہے نمود
لوگ تو دوڑے ہیں بجھانے کو
دوڑے یہ لے رکابی کھانے کو

ایسی تیز اور زہریلی ہجوؤں سے ضاحک ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بدنام ہوگئے۔

سودا کے مرثیے بھی بہت مشہور ہیں وہ مرثیے کے بھی بڑے شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ مثنویاں بھی لکھی ہیں۔ فارسی میں بھی شعر کہے ہیں۔ بڑے شاعر تھے۔ ہر رنگ میں کہتے تھے اور خوب کہتے تھے۔ انہوں نے مزے مزے کی پہیلیاں بھی لکھی ہیں۔ ذرا یہ پہیلی تو بوجھیے "ایک پہیلا سدا نویلا جو بوجھے سو زندہ رہے زندہ میں سے مردہ نکلے۔ مردے میں سے زندہ رہے۔ کھانے کی چیز ہے۔ ہار گئے۔ بھئی یہ تو انڈا ہے۔ ہے نا کمال کی پہیلی۔ سودا ایسے ہی کمال کے شاعر تھے۔ ۱۷۸۱ء میں وہ دنیا سے رخصت ہوگئے مگر ان کا نام اور شاعری ہمیشہ زندہ رہے گی۔ ان کے دور میں میر تقی میر، خواجہ میردرد، اور میر سوز جیسے زبردست شاعر موجود تھے مگر سودا کی استادی اور بڑائی کو سب نے تسلیم کیا۔

تحریری مباحثہ

ٹیوشن
رحمت ہے یا زحمت

ایک رائے

ان حالات میں جب کہ اسکولوں سے تعلیم ناپید ہوگئی ہے، ٹیوشن ہی وہ راستہ ہے جس سے ایک طالب علم استاد کی خصوصی توجہ کے ساتھ علم حاصل کرسکتا ہے۔

اِس لئے ٹیوشن رحمت ہے!

ایک دلیل

استادوں نے ٹیوشن سینٹروں کی صورت میں متوازی اسکول قائم کر رکھے ہیں جہاں سے اُن کو بے پناہ مالی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ جب کہ طلبہ کو کئی گنا زیادہ فیس ادا کرنے کے باوجود سوائے گیس پیپرز کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اِس لئے ٹیوشن زحمت ہے!

آپ کا کیا خیال ہے؟

اپنی رائے ہمیں لکھ بھیجئے .... لیکن

- آپ کی تحریر تین فل اسکیپ صفحات سے زیادہ طویل نہ ہو۔
- کاغذ کے ایک طرف، لائن چھوڑ کر خوش خط لکھا ہو۔
- اور تحریریں ۳۰ر اگست ۱۹۹۵ء تک ہمیں موصول ہو جائیں

پتا

تحریری مباحثہ ــــ ماہنامہ آنکھ مچولی، اے پی آئی بی کالونی، کراچی ۱

وفادار دوست

ترجمہ: عروج احمد خان

یہ اس زمانے کی بات ہے جب کتا انسان کے ساتھ نہیں رہا کرتا تھا۔ اس وقت اسے ایک وحشی جانور سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ وہ دوسرے جنگلی جانوروں کی طرح جنگل میں رہتا تھا ——— بھیڑیا اس کا بڑا بھائی تھا۔ دونوں مل کر شکار کیا کرتے تھے۔ اور مل جل کر رہتے تھے۔

ایک مرتبہ سردیوں کے موسم میں انہیں متواتر تین دن تک شکار نہ ملا۔ کیونکہ سردیوں میں جب بارش برس رہی ہو تو ایک چوہا تک جنگل میں نظر نہیں آتا۔ کتے اور بھیڑیے کے پاس کھانے کے لئے گوشت کا ایک ریشہ تک نہ تھا۔ انہوں نے تین دن تک تو بھوک کا مقابلہ کیا۔ لیکن چوتھے دن کتے کی ہمت جواب دے گئی۔ کیونکہ وہ چھوٹا تھا اور زیادہ دیر بھوک برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ بھیڑیا بڑا ہونے کی وجہ سے زیادہ باہمت تھا اور صابر بھی۔

بھوک سے تنگ آکر بھیڑیے سے کتا بولا ”بھائی اب مجھ سے مزید بھوک برداشت نہیں ہوتی۔ اٹھو چلو کھانے کا انتظام کرو۔“

بھیڑیے نے جواب دیا ”بیوقوف مت بنو۔ باہر

سردی کی شدت دیکھی ہے۔ جم کر ہماری قلفی بن جائے گی۔ اور گیدڑ اس سے موج اڑائیں گے۔ خاموشی سے سو جاؤ۔ تم میری بھی ہمت پست کر دو گے۔"

کتا یہ جھڑکی سن کر خاموش ہوگیا۔ لیکن کچھ دیر بعد سردی سے بیتاب دوبارہ بولا "مجھے سردی بھی لگ رہی ہے۔ مجھے بتاؤ میں کیا کروں۔"

لیکن بھڑیا بغیر کوئی جواب دیئے لیٹا رہا۔ اس نے اپنی موٹی دم اپنے گرد اچھی طرح لپیٹ لی تھی۔ جو سردی کے خلاف اسکی بہترین محافظ تھی۔ اب اگر کتے کی دم پتلی اور بغیر بالوں کے تھی تو اس میں بھیڑیے کا کیا قصور تھا۔

بھیڑیے کی طرف سے کوئی جواب نہ پاکر کتا بولا کہ اچھا میں اس طرح کرتا ہوں کہ آدمی کی جھونپڑی کے باہر جلتی ہوئی آگ سے خود کو گرم کرتا ہوں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کی پھینکی ہوئی چیزوں میں سے مجھے کوئی ہڈی یا چھیچھڑا مل جائے جس سے میں اپنے پیٹ کی آگ بجھا سکوں۔

کتے کی بات سن کر بھیڑیے نے درشتی سے اسے ڈانٹا "بکومت...... تم نہیں جانتے آدمی ہمارا کتنا بڑا دشمن ہے۔ وہ اپنا نیزہ تمہارے پیٹ میں بھونک کر تمہیں ہر چیز سے نجات دلا دے گا۔"

لیکن کتے نے اصرار کیا کہ صرف تھوڑی دیر کے لئے وہ وہاں آگ تاپے گا اور پھر واپس آجائے گا۔

بھیڑیا سمجھ چکا تھا کہ اب اسکو روکنا ناممکن ہے۔ چنانچہ بادل ناخواستہ اس نے کتے کو باہر نکلنے کی اجازت دے دی۔

کتا سہما ہوا اپنے بھٹ سے باہر نکلا اور ڈرتا ڈرتا آدمی کے جھونپڑے کی طرف چل پڑا۔ جھونپڑے کے باہر آگ جلی ہوئی تھی۔ وہ ابھی آگ کے پاس پہنچا ہی تھا کہ آدمی کی پالتو مرغیوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ کیونکہ پہلے بھی کئی دفعہ اس طرح ہو چکا تھا کہ کتا ان میں سے کسی پر ہاتھ صاف کر جاتا تھا۔

اپنی مرغیوں کا شور سن کر انسان باہر نکلا تو اس نے آگ کے پاس کتے کو دبکے ہوئے دیکھا۔ انسان نے اس وحشی جانور کو اپنے نیزے سے مار ڈالنا چاہا تو اچانک کتا بول اٹھا، "خدا کے لئے مجھے کچھ مت کہو میں تمہارے پرندے چرانے نہیں آیا صرف کچھ دیر کے لئے آگ کے پاس بیٹھنے آیا ہوں۔ مجھے بخش دو۔"

آدمی اس کی یہ التجا سن کر پسیج گیا اور اسے آگ کے پاس بیٹھنے کی اجازت دے دی۔ لیکن وہ نیزا اٹھائے اس کے قریب ہی کھڑا رہا تاکہ کتا شرارت کرنے سے باز رہے۔ مزید مہربانی آدمی نے یہ کی کہ اسکی حالت زار دیکھ کر اسے کچھ گوشت کے ٹکڑے کھانے کو دے دیئے۔

کتا اسکی اس مہربانی سے ممنون ہوکر بولا "تمہارا شکریہ! میں اب کبھی تمہاری چیزوں کو نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔"

کچھ دیر بعد آدمی نے پوچھا "کیا تم اب اس

یہ سچ ہے

○ جب ہم بولتے ہیں تو ہمارے ۷۰ عضلات حرکت کرتے ہیں۔

○ ایک کلو شہد تیار کرنے کے لئے شہد کی مکھی کو بارہ لاکھ چالیس ہزار پھولوں کا رس چوسنا پڑتا ہے۔

○ انسانی دماغ کا وقت ۲۸ اونس ہوتا ہے۔

○ انسان ایک منٹ میں ایک سو پچاس الفاظ بول سکتا ہے۔

○ انسانی جسم میں پسلیوں کی تعداد ۲۴ ہوتی ہے۔

○ مختلف انسانی جسموں میں کل ۴ قسم کا خون پایا جاتا ہے۔

○ انسانی آنکھ کا وزن ۷ گرام ہوتا ہے۔

○ روشنی ایک سیکنڈ میں ایک لاکھ ۸۶ ہزار میل کا سفر طے کرتی ہے۔

مرسلہ: عبداللہ ادیب، پشاور

قابل ہوگئے ہو کہ واپس اپنے بھٹ میں جاسکو۔"

کتے نے جواب دیا "نہیں۔" کیونکہ اس کا ذہن کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ اس نے اندازہ لگایا تھا کہ آدمی کے ساتھ رہنا اس بات سے بدرجہا بہتر ہے کہ جنگل میں بھوک سے مرا جائے۔

اس نے ڈرتے ڈرتے آدمی سے کہا "اگر تم میری درخواست سنو تو تمہارا بڑا احسان ہوگا۔"

آدمی نے بیزاری سے کہا "جلدی کہو مجھے سخت نیند آرہی ہے۔"

کتا بولا "اگر تم مجھے اپنے ساتھ رکھ لو تو میں تمہارا بہت بڑا مددگار ثابت ہوں گا۔" آدمی حیرانی سے بولا "وہ کس طرح!؟"

کتا کہنے لگا "دیکھو رات کو میں تمہاری جھونپڑی کی اور مرغیوں کی حفاظت کروں گا اگر کوئی انہیں نقصان پہنچانا چاہے گا تو میں بھونک بھونک کر تمہیں جگا دوں گا۔ جب تم شکار کے لئے جاؤ گے تو میں تمہاری رہنمائی کروں گا۔ اور تمہارے شکار کئے ہوئے جانوروں کو تم تک لے آؤں گا۔ اس کے بدلے تم مجھے کچھ کھانے کو دے دیا کرنا اور آگ کے پاس آرام کرنے دینا۔"

انسان نے ایک لمحے کے لئے اسکی پیش کش پر غور کیا اور پھر بولا "مجھے منظور ہے۔"

وہ دن اور آج کا دن، کتا آدمی کا ایک وفادار دوست ہے۔ اور اب ایک گھریلو، پالتو جانور کی حیثیت سے آدمی کے ساتھ رہتا ہے۔

اور اب بھی دیہاتوں میں بھیڑیے کے بولنے کی آواز آتی ہے تو وہ اپنے بھائی کو انسان کی غلامی ترک کر کے جنگل میں واپس آنے کے لئے کہہ رہا ہوتا ہے۔ لیکن اب ایسا ہونا ناممکن ہے۔ کیونکہ کتا اس آرام و سکون کی زندگی چھوڑ کر دوبارہ جنگل کی سخت زندگی نہیں اپنا سکتا۔ اسی لئے وہ بھونک بھونک کر بھیڑیے کو انکار کر دیتا ہے۔ اور بھیڑیا مایوس لوٹ جاتا ہے۔ جبکہ ہم لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بھیڑیا کتے سے ڈر کر واپس بھاگ گیا ہے۔

(ایک افریقی لوک کہانی سے ماخوذ)

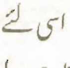

خالد خلیل

بے چارے پینگوئن

پینگوئن دنیا کے ان پرندوں میں سے ہے جو اُڑ نہیں سکتے لیکن انسانوں کی طرح دو ٹانگوں پر کھڑے ہو سکتے ہیں اور چل سکتے ہیں ان کی ایک بڑی تعداد جنوبی افریقہ کے ساحل پر رہتی تھی لیکن پچھلے ۶۰ سالوں میں آلودگی اور موسمیاتی اثرات کی وجہ سے وہاں ان کی ۹۰ فیصد آبادی ختم ہو گئی ہے اور اب وہاں بہت تھوڑی تعداد باقی بچی ہے ۔ اور اس کو بھی ماحولیاتی آلودگی کا سامنا ہے اس وقت جنوبی افریقہ کے ساحل پر تیل کی موجودگی ان پرندوں کو نقصان پہنچا رہی ہے ۔ یہ وہ تیل ہے جو جہازوں سے خارج ہوتا ہے اور ساحل پر آکر جمع ہو جاتا ہے ۔

پرندوں کی بڑی تعداد میں ہلاکت کے باعث جنوبی افریقہ کی وائلڈ لائف آرگنائزیشن نے فوراً ایک ریسکیو پروگرام شروع کیا ہے جس کے تحت آلودگی زدہ پرندوں کو ساحل سے ایک خصوصی مرکز میں منتقل کر کے ان کو صاف پانی اور دیگر خصوصی لوشن سے نہلایا جاتا ہے اور نشانی کے طور پر ان کے پاؤں میں ایک رنگ ڈال دیا جاتا ہے اور پھر واپس ان کو سمندر میں چھوڑ دیا ہے ۔ وائلڈ لائف آرگنائزیشن کے سربراہ کے مطابق اس عمل سے کافی عرصے کیلئے پینگوئن کا مستقبل محفوظ ہو جائے گا ۔ لیکن خطرہ بہرحال موجود رہے گا اور یہ صرف اسی صورت میں ختم ہو گا جب جنوبی افریقہ کا ساحل آلودگی سے پاک ہو جائے گا ۔

گھر کو واپسی

پینگوئن کو صاف پانی سے نہلایا جا رہا ہے ۔

سینٹر سے واپسی پر پینگوئن ایک ٹرالی میں

آلودگی سے پاک ہونے کے بعد پینگوئن خصوصی بکسوں میں

راکٹ کی کہانی

رخشندہ خالد

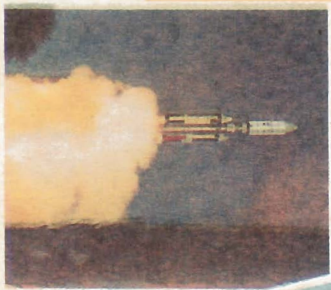

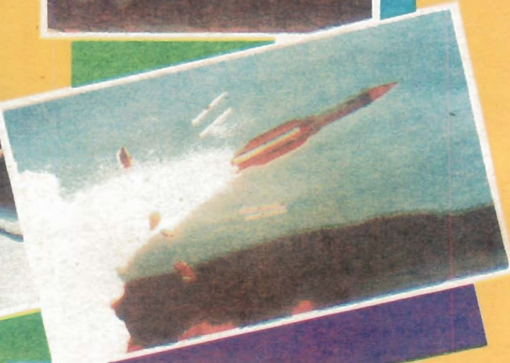

ایک زمانہ تھا کہ جنگ تلواروں سے لڑی جاتی تھی۔ آدمی، آدمی سے لڑتا تھا اس قسم کی لڑائی کا فائدہ یہ تھا کہ آدمی کو کم از کم اپنی بہادری دکھانے کا موقع مل جاتا تھا لیکن پھر رفتہ رفتہ توپ ٹینک وغیرہ ایجاد ہوگئے۔ ان کی ایجاد سے یہ تو ہوا کہ جنگ جیتنا پہلے کے مقابلے میں آسان ہوگیا لیکن وہ جو شجاعت اور بہادری وغیرہ دکھانے کا معاملہ تھا، وہ ختم ہوگیا۔ کیونکہ توپ اور ٹینک تو صرف تباہی پھیلاتے ہیں، اور انہیں اسی مقصد کے لئے ایجاد بھی کیا گیا ہے۔ اس مختصر مضمون میں ہم آپ کو بتائیں گے کہ تلوار کے بعد دور مار ہتھیاروں میں سب سے پہلے کون سا ہتھیار مقبول ہوا۔

راکٹ کا آپ نے یقیناً نام سنا ہوگا۔ شاید آپ یہ سمجھتے ہوں کہ راکٹ آج کل کے زمانے کی ایجاد ہے۔ جب کہ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ راکٹ آج سے آٹھ سو سال پہلے ایجاد ہوچکے تھے۔ چینیوں نے ۱۲۰۰ء میں اسے منگولوں کے خلاف لڑائی میں استعمال کیا تھا۔ آج کل کی طرح اس زمانے میں بھی راکٹ کے اندر بارود استعمال کی جاتی تھی اور اس زمانے میں یہ خاصا مہلک ہتھیار سمجھا جاتا تھا۔ منگولوں نے راکٹ کی تباہ کاری دیکھی تو وہ اس سے خاصے مرعوب ہوئے اور جب تیرہویں صدی کے درمیانی عرصے میں ان کی جنگ عرب مسلمانوں سے ہوئی تو انہوں نے اس جنگ میں راکٹ کا استعمال کیا۔ اور اس طرح راکٹ عرب مسلمانوں سے ہوتا ہوا فرانسیسیوں میں متعارف ہوا۔ کیونکہ عرب مسلمانوں کی لڑائی جب فرانسیسیوں سے ہوئی تو مسلمانوں نے ان پر راکٹ برسائے تھے۔ فرانسیسی بھی راکٹ سے متاثر ہوئے اور انہوں نے اس کے استعمال کو یورپ میں عام کردیا۔

راکٹ یورپ میں اس طرح متعارف ہوئے کہ فرانسیسی فوجوں کی لڑائی برطانوی فوج سے ہوئی تو فرانسیسی فوج نے جان آف آرک کی قیادت میں اپنے شہروں کا دفاع راکٹ کی مدد سے کیا تھا اور یوں برطانوی فوج اس "بلا" (راکٹ) سے پہلی بار واقف ہوئی۔ یہ ۱۴۲۹ء کا واقعہ ہے کہ جلد ہی راکٹ جنگی محاذ سے غائب ہوتا گیا۔ کیوں؟ اس لئے کہ رائفلیں ایجاد ہوگئیں تھیں، جن کا نشانہ زیادہ درست ہوتا تھا ۱۵۰۰ء تک اٹلی اور یورپ کے دوسرے شہروں میں راکٹ کو آتشیں نمائش کے لئے استعمال کیا جاتا رہا۔ لیکن ۱۷۰۰ء میں راکٹ کو دوبارہ میدانِ جنگ میں لے آیا گیا۔ ۱۷۹۲ء میں برطانیہ نے ہندوستان کے اندر ایسٹ انڈیا کمپنی کے روپ میں لڑتے ہوئے راکٹ کا

استعمال کیا۔ پھر جنگی ماہرین نے راکٹ کو کچھ اور ترقی دی اور اسے جنگی لحاظ سے زیادہ مؤثر بنایا۔

آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ یہی راکٹ آگے چل کر خلائی مشن کو پورا کرنے میں مددگار ثابت ہوا۔

راکٹ پہلی جنگِ عظیم میں بھی استعمال کیا گیا جب برطانیہ نے اسی کے ذریعے جرمنی کے جہازوں کو نشانہ بنایا اور پھر آگے چل کر یہی راکٹ ترقی دے کر میزائل کو وجود میں لانے کا باعث ہوئے۔ اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ راکٹ کتنا قدیم کتنا مقبول اور جنگی اعتبار سے کتنا مفید ہتھیار رہا ہے۔

اپنی نگارشات
صاف خوشخط کاغذ کے ایک
جانب ایک سطر چھوڑ کر لکھیں

نقل شدہ، طویل اور
غیر معیاری تحریریں شائع
نہ ہوسکیں گی

جو تحریر آپ ہمیں بھجوائیں
اس کی نقل اپنے پاس محفوظ رکھیں
اور ہم سے واپسی کا تقاضہ نہ کریں۔

ہوائیوں کہ

ہر انسان کی زندگی مختلف نوعیت کے واقعات سے بھری ہوتی ہے۔ کچھ واقعات خوشی بخشنے والے ہوتے ہیں کچھ دکھ دینے والے، کچھ حیران کن ہیں کچھ مضحکہ خیز۔ یقیناً آپ کی زندگی میں بھی کوئی ایسا واقعہ رونما ہوا ہوگا جب آپ خوشی سے پھولے نہیں سمائے ہوں گے یا غم سے آنسو نکل پڑے ہوں گے۔ کوئی ایسا واقعہ جب حیرت سے آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی ہوں یا خوف سے رونگھٹے کھڑے ہوگئے ہوں یا ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے ہوں اگر ایسا کوئی واقعہ آپ کے ساتھ پیش آیا ہو تو ہمیں لکھ بھیجئے۔ ہم اسے آنکھ مچولی میں آپ کے نام اور تصویر کے ساتھ شائع کردیں گے۔ لیکن دھیان رہے کہ واقعہ آپ کا ذاتی اور بالکل سچّا ہو۔ اور زیادہ سے زیادہ دو فل اسکیپ صفحات تک طویل ہو۔ بہترین واقعہ بھیجنے والے کو خوب صورت تحفہ بھی ارسال کیا جائے گا۔

پتا: انچارج مقابلہ ہوائیوں کہ... ماھنامہ آنکھ مچولی، اے پی آئی بی کالونی، کراچی

ٹھنڈی موت

تحریر: پولا ایملی ڈی اولیئر — ترجمہ: ریحانہ منیر

فروری ۱۹۸۷ء کی بیس تاریخ۔ جمعہ کا دن۔ ویسٹ بروک میں موسم صاف اور خوش گوار تھا۔ چھ سالہ برٹنی اور نو سالہ تارا بہت دیر پہلے گھر سے نکلی تھیں۔ انہوں نے کارنر کے اسٹور سے کینڈی بار خریدیں اور اب ٹہلتی اور کھیلتی کودتی واپس گھر جا رہی تھیں۔ جب وہ سالٹ آئرلینڈ پونڈ نامی تالاب کے قریب سے گزریں تو انہوں نے ایک سفید رنگ کی گیند دیکھی۔ فروری کا مہینہ تھا۔ تالاب پر برف کی موٹی تہہ جمی ہوئی تھی۔ گیند بھی برف پر پڑی تھی۔ تالاب کے تین اطراف لوہے کی تاروں کی جالی دار باڑ لگی تھی۔ اور سڑک کی جانب باڑ کے بجائے پتھروں کی مضبوط دیوار بنی ہوئی تھی۔ باڑ اور دیوار کے درمیان تھوڑی سی جگہ تھی۔ دونوں بچیاں گھس گھسا کر اس تھوڑی سی جگہ سے اندر داخل ہوئیں اور گیند کی طرف دوڑ پڑیں۔

برٹنی گیند کے قریب پہنچ چکی تھی۔ لیکن تارا گیند کو اچک لینا چاہتی تھی۔ اس نے تیزی سے برف پر سلپ لگائی تاکہ برٹنی سے پہلے گیند حاصل کرلے مگر......برٹنی نے اس کی چیخ سنی..... "مجھے بچاؤ" تیزی سے مڑکر دیکھا تو تارا تالاب میں ڈوبتی نظر آئی۔ کوئی لمحہ ضائع کئے بغیر برٹنی اپنی دوست کو بچانے کے لئے آگے بڑھی۔ اس نے تارا کی جیکٹ کو پکڑا تاکہ اسے پانی سے باہر کھینچ لے۔ لیکن برف اتنی مضبوط بھی نہیں تھی کہ دونوں کا وزن سہار لیتی۔ برٹنی کے پیروں تلے برف ٹوٹ گئی اور وہ بھی یخ پانی میں جا پڑی۔

دونوں بچیاں چیخ رہی تھیں۔ مدد کے لئے پکار رہی تھیں۔ بچنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی تھیں۔ مگر کب تک۔ تھوڑی دیر بعد تارا کی چیخیں تھم گئیں۔ اس کے جسم کی حرکت بھی رک گئی اور وہ پانی میں ڈوب گئی۔ برٹنی کو پانی کے نیچے صرف اس کے گھنگریالے بال نظر آرہے تھے۔

"تارا میری سب سے اچھی دوست تھی"۔ برٹنی نے دکھ کے ساتھ سوچا۔ وہ اسے ڈوبنے سے بچانے کے لئے برابر کوشش کرتی رہی تھی۔ مگر بالآخر تارا کی جیکٹ اس کی گرفت سے نکل گئی۔ اب برٹنی خود اپنا سر پانی سے اوپر رکھنے کی کوشش میں مگن تھی۔ چاروں طرف برف جمی تھی۔ صرف وہی چھوٹا سا شگاف تھا جہاں سے تارا ڈوبی تھی اور جو تارا کے گرنے سے بنا تھا۔ اس ذرا سی جگہ میں تیرنا ممکن نہیں تھا۔ چند لمحوں کے بعد برٹنی بھی پانی کے نیچے چلی گئی۔ اس کے قدموں نے تالاب کی کیچڑ بھری تہہ کو چھوا۔ برٹنی نے خود کو سطح کی طرف دھکیلا۔ سرپانی سے باہر آیا مگر فوراً ہی وہ پھر ڈوب گئی۔ اس جدوجہد میں پانی اس کے پھیپھڑوں میں بھر گیا اور اس کی سانس رک گئی۔

دونوں بچیاں بے حس و حرکت ہوگئی تھیں۔ دل دھڑکنا بند ہوگئے تھے۔ تارا سطح سے چھ فٹ نیچے تالاب کی دلدلی تہہ میں پڑی تھی۔ برٹنی جیکٹ میں ہوا بھرنے کی وجہ سے ڈوبنے سے بچ گئی تھی مگر اس کا سر اب بھی پانی کی سطح سے نیچے تھا۔ اور وہ ادھر ادھر بہہ رہی تھی۔

تالاب سے ذرا آگے پیلے رنگ کا ایک خوبصورت مکان تھا۔ اس کی دوسری منزل پر اپنے کمرے میں بیٹھی اٹھتر سالہ جیوا رنکس کچھ بُن رہی تھی۔ اسے یوں لگا جیسے کچھ ہوا ہو۔ اسے ٹھیک سے یاد تو نہیں تھا کہ اس نے کچھ سنا ہے۔ مگر پھر بھی کسی انجانی اور ان دیکھی قوت کے زیر اثر اس نے اپنا کام بند کیا۔ اپنی جگہ سے اٹھی، باورچی خانے میں پہنچی اور کھڑکی سے باہر جھانکا۔ اسے تالاب میں کچھ حرکت محسوس

ہوئی۔ تب اس نے کسی کو پانی میں ہاتھ پاؤں مارتے دیکھا اور مدد کے لئے پکارتے سنا۔

"اوہ میرے خدا!" اس نے سوچا "میں کیا کروں..... میں کر کیا سکتی ہوں؟" اسے ایک ہنگامی ٹیلی فون نمبر یاد آیا۔ یہ نمبر اس نے کہیں سنا تھا اور حسنِ اتفاق سے اسے یاد رہ گیا تھا۔ مگر پھر بھی وہ مشکوک تھی۔ وہ دعا کر رہی تھی کہ اللہ کرے نمبر ٹھیک ہی ہو۔ اس نے ریسیور اٹھایا اور نمبر گھمایا.....۹۱۱...... دوسری طرف سے فوراً جواب آیا۔ "یہ ایمرجینسی ہے۔" جیوا فوراً اپنی بھاری آواز میں چلائی۔ "سالٹ آئرلینڈ روڈ۔" اس وقت اس سے بہتر انداز میں صورت حال کی ترجمانی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے لہجے سے حالات کی سنگینی کا اندازہ ہو رہا تھا۔ اسے نے جلدی جلدی پیغام دیا۔

"دو بچیاں... تالاب میں..... مدد مدد"!

اس وقت سہ پہر کے تین بج کر چوّن منٹ ہوئے تھے۔ ایمرجینسی میں ڈیوٹی پر کارل بک تھا۔ اس نے فوراً پولیس، فائر بریگیڈ اور ایمبولینس کے محکموں کو یہ پیغام پہنچا دیا۔

ریسیور رکھنے کے بعد جیوا تیزی سے واپس باورچی خانے میں آئی۔ بچیاں ساکت ہو چکی تھیں۔ صرف تالاب میں پڑنے والے شگاف میں ایک گلابی ہیٹ اور ایک جامنی رنگ کی جیکٹ تیرتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ جیوا باہر کی جانب بھاگی۔ جب وہ تالاب کے کنارے تک پہنچی تو پانی پر صرف بلبلے باقی رہ گئے تھے۔ دونوں بچیاں پانی کے نیچے جا چکی تھیں۔

اس دن ۳۷ سالہ سپاہی رچ وارڈل نے ہیڈ کوارٹر جاتے ہوئے اپنے معمول کے رستے سے ہٹ کر ٹاؤن روڈ کا راستہ اختیار کیا تھا۔ اسے چار بجے حاضری لگانی تھی۔ وہ سالٹ آئرلینڈ روڈ سے صرف آدھا میل دور تھا جب اس نے اپنے کار ریڈیو پر یہ ایمرجینسی پیغام سنا۔ وارڈل نے فوراً گاڑی کا رخ موڑا، سائرن بجاتے اور لائٹیں چمکاتے ہوئے وہ تیزی سے سالٹ آئرلینڈ روڈ کی طرف دوڑا۔ اس نے خاصی دور سے تالاب کو دیکھ لیا تھا۔ کنارے سے قریباً بیس فٹ دور پانی کی سطح سے نیچے جامنی رنگ کی جیکٹ نظر آ رہی تھی۔ اس نے تیزی سے بریک لگائے۔ گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی۔ وہ کود کر نیچے اترا اور دوڑ کر چھلانگ لگائی اور باڑ کے اوپر سے ہوا میں اڑتا ہوا تالاب میں جا پڑا۔ وہ اس وقت پوری وردی میں تھا۔ یونیفارم، بوٹ، گن اور بیلٹ۔ اس نے کوشش کی تھی کہ تالاب میں جتنا اندر تک ممکن ہو، وہ جا کر گرے۔ وہ گرا اور برف کو توڑتا ہوا پانی میں اتر گیا۔ تالاب یہاں زیادہ گہرا نہیں

تھا۔ وہ برف کو مکّوں اور گھونسوں سے توڑتا ہوا جلدی جلدی آگے بڑھنے لگا۔

چند لمحے پہلے، تالاب کے ایک قریبی مکان میں موجود ایک رضاکار فائر کیپٹن پیٹ مرفی نے اپنے اسکینر پر ایمرجینسی الارم سنا تھا۔ اس نے پکار کر اپنے بیٹے سے کہا۔ "گاڑی کی ڈگی سے رسی نکال لاؤ۔" اور خود وہ باڑ کی طرف دوڑا۔ لڑکا رسی لے آیا تھا۔ مرفی نے اس کے ہاتھ سے رسی کا بنڈل جھپٹا، ایک سرا کنارے پر موجود درخت سے باندھا اور رسی کی مدد سے لٹک کر تالاب کے کنارے پہنچ گیا۔

اسی دوران میں رچ وارڈل پانی میں آگے ہی آگے بڑھتا ہوا جیکٹ تک پہنچ چکا تھا۔ اس نے بے حس و حرکت بچی کو اپنی بانہوں میں بھرا، کنارے کی طرف بڑھا اور اسے کنارے پر موجود مرفی کے حوالے کر دیا۔ ایک اور سپاہی اسکاٹ مارٹن بھی وہاں پہنچ چکا تھا۔ مارٹن نے فوراً برٹنی کے پیٹ سے پانی نکالا۔ اس کی سانس کی نالی صاف کی اور مصنوعی طریقے سے اسے سانس دلانے کی کوشش کرنے لگا۔ برٹنی کی سانس رکی ہوئی تھی۔ نبض ڈوب چکی تھیں اور دھڑکن بند تھی۔ طبّی نقطۂ نظر سے وہ مرچکی تھی۔ اس میں زندگی کے کوئی آثار موجود نہیں تھے۔ مارٹن، جو ایک سند یافتہ ایمرجینسی میڈیکل ٹیکنیشن تھا اور ماہر قانون بھی، اپنے آپ کو بچی کی موت کے صدمے کے لئے تیار کرچکا تھا۔ لیکن اس نے اپنی کوششیں جاری رکھی۔ بالآخر اس کی محنت رنگ لائی۔ تین چار منٹ کے بعد برٹنی کو کھانسی ہوئی اور اس نے چلّانا شروع کردیا۔

"اللہ تیرا شکر! ایک بچی تو زندہ اور خیریت سے ہے۔" وارڈل نے سوچا وہ اس وقت بھی تارا کی تلاش میں تالاب میں غوطے لگا رہا تھا۔ برف کی موٹی تہہ کی وجہ سے پانی کے اندر گہری تاریکی تھی۔ وہ کئی بار غوطہ لگا چکا تھا۔ مگر تارا کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ یخ پانی میں سخت جدوجہد کی وجہ سے وارڈل تھک چکا تھا "کیا واقعی کوئی اور لڑکی بھی تھی؟" وارڈل نے جب بھی پانی سے سر نکالا تو اس بات کی تصدیق چاہی۔ "مجھے تو یہاں کچھ بھی نہیں مل رہا۔"

دس منٹ بعد یخ پانی نے اپنا کام دکھانا شروع کیا۔ وارڈل کا تھکن کے مارے بُرا حال تھا۔ دماغ تاریکی میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ وہ پانی کے نیچے تارا کی تلاش کے بارے میں اپنے طے شدہ طریقہ کار سے ہٹتا جا رہا تھا۔ مکوں سے برف ...... توڑتے ہوئے آگے بڑھنے کی وجہ سے وارڈل کا بائیں کندھا اور دونوں ہاتھ شدید زخمی ہوچکے تھے اور ان سے بے تحاشا خون بہہ رہا

تھا۔ مگر اس پر اب بھی یہی دھن سوار تھی کہ کسی نہ کسی طرح بچی کو ڈھونڈ نکالے۔ جب یہاں یہ سب کچھ ہو رہا تھا تو تالاب سے چند میل کی دوری پر ایک رضاکار فائر فائٹر اور ماہر غوطہ خور مارک ہاربمین زکام کی وجہ سے چھٹی کر کے گھر پر لیٹا تھا۔ جونہی اسے پیجر پر اس حادثے کے بارے میں پیغام ملا۔ وہ پھرتی سے اٹھا۔ ایک گیلا سوٹ پہنا' اچھل کر اپنی کار میں بیٹھا اور جائے حادثے کی طرف دوڑ پڑا۔ اس وقت تک وارڈل بے ہوش ہو چکا تھا اور اس کے ساتھیوں نے اسے کنارے پر کھینچ لیا تھا۔

ہاربمین کیل کانٹے سے لیس ہوا۔ اس نے ماسک پہنا' لوگوں کی بے چین آوازوں کا شور سنا' جو اس سے جلدی جلدی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ ایک لمبا سانس کھینچا اور برفیلے پانی میں اتر گیا۔

اپنی پہلی کوشش میں ہاربمین کو کوئی ٹھوس چیز محسوس ہوئی۔ مگر یہ کنکریٹ کا بلاک تھا۔ اس نے دوبارہ کوشش کی۔ اور تیرتا ہوا برف کے نیچے پہنچ گیا۔ باہر آنے کے لئے اس نے نیچے سے مکوں کی مدد سے برف کو توڑنا چاہا مگر ایسا کرنا ناممکن تھا اپنے آپ کو پر سکون رکھتے ہوئے اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ اسے ایک جگہ روشنی سی محسوس ہوئی۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں برف میں شگاف بن چکا تھا۔ سورج کی روشنی اسی جگہ سے اندر آ رہی تھی ورنہ تو تمام تالاب میں گھپ اندھیرا تھا۔ وہ تیرتا ہوا وہاں تک آیا اور سطح پر ابھر کر سانس لیا۔ اپنے پھیپھڑوں کو ہوا سے بھر کر اس نے ایک پھر غوطہ لگایا۔ کنارے سے خاصی دور' برف کے نیچے' ہاتھوں کی مدد سے تلاش کرتے ہوئے اس نے شاخ نما ایک شے کو گرفت میں لیا۔ لیکن اس وقت تک اس کا سانس اکھڑ چکا تھا۔ سانس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے اس شاخ نما شے کو تفصیل سے ٹٹولا۔ یہ تارا کا بازو تھا۔ برفیلے پانی کی وجہ سے وہ بالکل منجمد ہو چکا تھا۔ اس کا پورا بدن ہی منجمد ہو چکا تھا۔ "کیا یہ بچ سکے گی؟" اس نے سوچا۔ اس کا خیال تھا کہ بچی مر چکی ہے۔

تارا کے بازو کو مضبوطی سے تھامے ہوئے اس نے روشنی کی طرف تیرنا شروع کیا۔ سطح پر ابھرتے ہوئے اس نے تالاب کے اندر ہی تارا کو مصنوعی طریقے سے سانس دلانے کی کوشش شروع کر دی۔ وہ اس عمل کو دہراتے ہوئے کنارے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کنارے پر اس نے بے جان بچی کو دوسرے لوگوں کے حوالے کر دیا جہاں ایک سپاہی نے مصنوعی تنفس کا یہ عمل جاری رکھا۔

"ارے یہ تو تارا ہے.... کیا یہ زندہ ہے؟" کسی نے تارا کو پہچان لیا تھا اور فکر مندی سے

اس کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ مگر سپاہی نے کوئی جواب نہ دیا۔ تارا پندرہ منٹ تک یخ بستہ پانی میں ڈوبی رہی تھی۔ اس کی جلد بالکل برف ہو رہی تھی۔ آنکھوں کی پتلیاں اوپر کو چڑھ گئی تھیں..... سپاہی کا خیال تھا کہ یہ بچی بچ نہیں سکے گی۔

برٹنی اب ٹھیک تھی۔ اور خود سانس لے رہی تھی۔ لیکن تارا تاحال بے جان تھی۔ ایک ایمبولینس کے ذریعے انہیں فوراً" اسکیس کے شور لائن کلینک پہنچایا گیا۔ جو وہاں سے چار میل کے فاصلے پر تھا۔

کلینک میں عام طور پر چار بجے تک صرف ایک ڈاکٹر ڈیوٹی پر ہوتا تھا۔ لیکن اس روز اتفاق سے ڈاکٹر مائیکل سیکس ذرا جلدی آگئے تھے۔ ڈاکٹر ہربرٹ بریس ڈیوٹی ختم کر کے جانے والے تھے۔ یہی حال نرسوں کا تھا۔ نئی شفٹ کی نرسیں آگئی تھیں اور پہلے سے ڈیوٹی پر موجود نرسیں جانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ یوں جب تارا اور برٹنی کلینک پر پہنچیں تو دوگنا عملہ موجود تھا۔

ڈاکٹر بریس نے برٹنی کا علاج شروع کیا۔ اس کے جسم کا درجۂ حرارت ۹۰ ڈگری تک گر چکا تھا۔ ڈاکٹر سیکس تارا پر جھکے ہوئے تھے جس کے جسم کا درجۂ حرارت ۸۰ ڈگری تک پہنچا ہوا تھا اور جو ایک خطرناک صورت حال تھی۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئی تھیں اور ایک ہی جگہ منجمد تھیں۔ اس کے سینے پر لگا' دل کی دھڑکن چیک کرنے کا آلہ کسی دھڑکن کی نشان دہی نہیں کر رہا تھا۔ طبی نقطہ نظر سے تارا پچیس منٹ پہلے مر چکی تھی۔ ڈاکٹر سیکس کا اندازہ تھا کہ تارا کا سانس بحال ہونے کا صرف ایک فیصد چانس ہے۔ لیکن برفیلے پانی میں ہونے والے اس طرح کے حادثوں کے بعض اوقات حیرت انگیز نتائج نکلے تھے اور ڈاکٹر سیکس کو ان کے بارے میں علم تھا۔ لہٰذا وہ کسی معجزے کے رونما ہونے کی امید میں بڑی دل جمعی سے اپنی کوشش میں مصروف رہے۔ انہوں نے تارا کی سانس کی نالی میں پلاسٹک کی ایک نلکی کے ذریعے گرم آکسیجن داخل کی۔ اسے بجلی کے جھٹکے دیئے۔ دل کی حرکت بڑھانے والے انجکشن دیئے۔ ڈاکٹر اور نرسیں قریباً" بیس منٹ تک ہر ممکن طریقے سے تارا کا سانس بحال کرنے کی کوشش کرتے رہے مگر تارا ابھی تک بے حس و حرکت تھی۔ آخری حربے کے طور پر ڈاکٹر نے ایک لمبی سوئی کے ذریعے براہ راست تارا کے دل میں دھڑکن تیز کرنے کی ایک دوا انجیکٹ کی۔ نتیجہ حیرت انگیز تھا۔ ڈاکٹر خوشی سے چلا اٹھا۔

"دل نے کام کرنا شروع کر دیا"! پھر آہستہ آہستہ تارا کی نبض بھی بحال ہونے لگی اور بلڈ

پریشر بھی۔ لیکن وہ ابھی تک بے ہوش تھی۔ اور اس کے جسم میں معمولی سی جنبش بھی نہیں ہوئی تھی۔ بہرحال اس کے زندہ بچ رہنے کے آثار پیدا ہوگئے تھے۔

تارا کو ہیلی کاپٹر کے ذریعے بہتر علاج کے لئے وہاں سے پندرہ منٹ کی مسافت پر واقع یل نیوہیون ہسپتال میں لے جایا گیا۔ برنی ایمبولینس کے ذریعے یہاں پہنچی۔ وہ یہاں صرف ایک رات رہی اور حیرت انگیز طور پر بہت جلد مکمل صحت یاب ہوگئی۔ اگلی شام کو وہ ایک درخت پر چڑھی کھیل رہی تھی۔

چونکہ تارا بہت دیر تک پانی میں رہی تھی اس لئے اس کے علاج میں خاصے دن لگے۔ اس کے دماغ میں پانی بھر گیا تھا اور سوجن بھی تھی۔ اس لئے وہ بے حس و حرکت پڑی تھی۔ ڈاکٹروں نے دماغ سے پانی کو صاف کر دیا تھا۔ تارا صحت یاب ہو رہی تھی۔ مگر بہت آہستہ آہستہ دو ہفتے بعد وہ بیٹھنے کے قابل ہوئی۔ ادھر ادھر دیکھ بھی لیتی تھی۔ مگر ابھی تک وہ بول نہیں پائی تھی۔ یہاں سے مزید بہتر علاج کے لئے تارا کو نیو نگٹن چلڈرن ہاسپٹل میں منتقل کر دیا گیا۔ جن نرسوں نے تارا کو الوداع کیا تھا وہ اس بارے میں مشکوک تھیں کہ تارا کبھی بول بھی سکے گی۔ مگر صرف تین دن بعد تارا بول رہی تھی۔ اور نرسیں حیرت سے اسے تک رہی تھیں اور تارا کی ماں "کیتھی" کہہ رہی تھی۔ "میں اس لمحے کو کبھی فراموش نہیں کرسکوں گی۔"

آٹھ ہفتے بعد تارا گھر واپس آگئی اور چار دن بعد اسکول جانے لگی۔ اگرچہ شروع شروع میں اسے خصوصی کلاسیں لینی پڑیں مگر اب وہ نارمل بچوں کے ساتھ پڑھتی ہے۔ اور دس سال کی ایک صحت مند بچی ہے۔ برنی کے برعکس تارا کو اس حادثے کے بارے میں کچھ بھی یاد نہیں ہے۔

ایک بچی جو طبی لحاظ سے مرچکی تھی۔ دوبارہ زندہ ہوگئی۔ نیوہیون ہسپتال کے ڈاکٹر جولیو فونٹین کے نزدیک اس بچی کو بچانے میں ان لوگوں نے اہم اور بنیادی کردار ادا کیا تھا جنہوں نے ابتدائی طور پر اس کی مدد کی۔ یعنی فائر فائٹر' پولیس مین اور شور لائن کلینک کے ڈاکٹر۔

ادھر شور لائن کلینک کے ڈاکٹر سیکس کا کہنا تھا کہ میں کوئی مذہبی آدمی نہیں ہوں۔ لیکن حالات' واقعات اور اتفاقات کے جس تسلسل نے بچی کی جان بچائی اس کے پیش نظر میں یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ کوئی تو ہے جو اس دار غیب سے اس سارے عمل کی نگرانی کر رہا تھا۔

مزدور

ضیغم حمیدی

آؤ بچو! میں سناؤں داستاں مزدور کی
رحم کے قابل ہے حالت مفلس و مجبور کی

جو عمارت ہے بناتا' وہ بھی اک مزدور ہے
بوجھ لے کر جو ہے جاتا' وہ بھی اک مزدور ہے
جو ہے بچوں کو پڑھاتا' وہ بھی اک مزدور ہے
وہ جو ہے گاڑی چلاتا' وہ بھی اک مزدور ہے

وہ بھی ہے مزدور' کھیتوں میں چلاتا ہے جو ہل
شام کو پھر جسکے بازو تھک کے ہوجاتے ہیں شل
وہ بھی ہے مزدور جو لکھتا ہے نظمیں اور غزل
صرف اک مزدور ہے مزدور کا نعم البدل

اے مرے مزدور تو ہے قابلِ صد احترام
تو ہے محنت کش' تری محنت کی دنیا ہے غلام
چاہے دنیا کچھ کہے لیکن ہے تو اعلیٰ مقام
تیری محنت' تیری عظمت کو میں کرتا ہوں سلام

پاشکستہ اپنے گھر جب شام کو جاتا ہے یہ
پاکے اُجرت اور بھی مایوس ہو جاتا ہے یہ
غم کو کھا کے اور آنسو پی کے سو جاتا ہے یہ
اک نئی کل کیلئے خوابوں میں کھو جاتا ہے یہ

آؤ بچو! میں سناؤں داستاں مزدور کی
جانے کب بدلے گی حالت بے کس و مجبور کی

سوال آدھا جواب آدھا

مرتب: محمد بن مالک

سوال آدھا جواب آدھا

انعامی سلسلے "سوال آدھا جواب آدھا" کے بارے میں اکثر قارئین کی فرمائش ہے کہ اس میں شرکت کی تاریخ بڑھائی جائے۔ اپنے محترم قارئین کی خواہش کے احترام میں اس ماہ سے اس مقابلے میں ماہِ رواں کی ۱۰ تاریخ کے بجائے ۳۰ تاریخ تک شرکت کی جاسکے گی۔ اس لئے جون ۹۵ء کے شمارے میں شائع ہونے والے مقابلہ نمبر ۲ کے جوابات اگست ۹۵ء میں اور مقابلہ نمبر ۳ کے جوابات ستمبر ۹۵ء میں شائع کئے جائیں گے۔

(ادارہ)

مقابلہ نمبر ۳

۱۔ جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کنیت میں اپنی والدہ کے نام سے مشہور ہیں، یعنی ابن مریم کہلاتے ہیں۔ اسی طرح بتایئے اور کون سے پیغمبر کنیت میں اپنی والدہ کے نام سے پہچانے جاتے ہیں؟

۲۔ "فقیہہ الامت" حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا لقب ہے جو انہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا۔ بتایئے آپؐ نے کس صحابیؓ کو "امین الامت" کا لقب عطا فرمایا؟

۳۔ "مدوجزر" حالی کی نظم ہے۔ بتایئے "جزر ومد" کس کی نظم ہے؟

۴۔ علامہ شبلی نعمانی کے علاوہ "موازنہ انیس ودبیر" نامی تنقیدی کتاب کس نے لکھی؟

۵۔ سائنس میں رائٹ برادران تو ہوائی جہاز کی ایجاد کے لئے مشہور ہیں۔ آپ یہ بتایئے کہ گولفیئر برادران کیوں مشہور ہیں؟

۶۔ بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی نے دو شادیاں کی تھیں۔ کیا آپ بتاسکتے ہیں کہ مصور پاکستان علامہ اقبال نے کتنی شادیاں کیں؟

۷۔ کیا آپ بتاسکتے ہیں کہ اکبر کے علاوہ برصغیر کے کس حکمران کے نورتن تھے؟

۸۔ "برونائی" دنیا کا امیر ترین ملک ہے۔ دنیا کے غریب ترین ملک کا نام بتایئے؟

۹۔ کرکٹ ایک مشہور کھیل کا نام ہے۔ بتایئے اس کے علاوہ کرکٹ اور کس چیز کا نام ہے؟

۱۰۔ کرکٹ میں "تھری ڈبلیوز" کی اصطلاح تین ویسٹ انڈین کھلاڑیوں وکس، وارل اور والکاٹ کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ یہ بتایئے کہ "ٹرپل۔ ایس" کی اصطلاح سے کس ملک کے کون سے کھلاڑی مراد ہیں؟

ایک حاضر جواب خاوند کی مالی حالت بگڑ گئی تو ایک دن اس نے اپنی بیوی سے کہا۔ ”حالات خراب ہو گئے ہیں۔ یوں کرو کہ بچوں کو ننھیال بھیج دو اور تم اپنی والدہ کے گھر چلی جاؤ۔ میں بھی اللہ کے سہارے اپنے سسرال چلا جاتا ہوں۔

مرسلہ : نزہت فیاض، کراچی

---- ○ ----

ایک نئے قیدی نے اپنے ساتھی کو بتایا۔ ”میں چوری کے جرم میں پکڑا گیا ہوں، ویسے خطا میری ہی تھی۔“

”وہ کیسے؟“ دوسرے قیدی نے پوچھا۔

”وہ ایسے کہ میں نے اس کوٹھی کے کتے سے دوستی کرنے میں پورا ایک مہینہ لگا دیا۔ مگر چوری کی رات میرا پاؤں کوٹھی کی بلی پر جا پڑا۔“

مرسلہ : شمائلہ شکیل، اسلام آباد

---- ○ ----

تین کنجوس دوست کھجوریں کھا رہے تھے کہ چوتھا کنجوس دوست بھی ادھر آنکلا۔

اس نے اپنے دوستوں سے پوچھا۔

”کیا کھا رہے ہو؟“

دوستوں نے چڑ کر کہا، ”زہر کھا رہے ہیں۔“

یہ سننا تھا کہ اس نے ان کے ہاتھوں سے آٹھ دس کھجوریں چھین کر منہ میں رکھ لیں اور بولا۔ ”تم لوگوں کے بعد میں جی کر کیا کروں گا۔“

مرسلہ : جنید اختر، کراچی

---- ○ ----

ایک دوست (دوسرے دوست سے) اگر تمہارا ایک کان کسی حادثے میں کٹ جائے تو؟

دوسرا : تو میں ٹھیک سے سن نہ سکوں گا۔

پہلا : اگر دونوں کٹ جائیں تو؟

دوسرا : میں ٹھیک سے دیکھ نہ سکوں گا۔

پہلا : وہ کس طرح؟

دوسرا : وہ اس طرح کہ میرا چشمہ گر جائے گا۔

مرسلہ : کاشف عالم، کراچی۔

---- ○ ----

کانچ کے برتن بنانے والی ایک فیکٹری کے باہر ایک بورڈ پر یہ اعلان لکھا ہوا تھا۔

"ہمارے ہاں خوب صورت اور مضبوط برتن بنتے ہیں۔ ہمارے بنائے ہوئے گلاس پچیس فٹ تک کی بلندی سے نیچے گرایئے۔ چوبیس فٹ تک ضمانت ہے کہ گلاس نہیں ٹوٹے گا۔"

مرسلہ : محمد بلال، کراچی۔

---- ○ ----

پڑوا بیٹھا۔ اس کی عیادت کے لیے آنے والے ایک دوست نے اس سے کہا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہاری دونوں ٹانگیں کس طرح ٹوٹیں۔"

ان صاحب نے جل کر جواب دیا۔

"چھت سے گر کر دیکھو ---- بات سمجھ میں آجائے گی۔"

مرسلہ : ندیم شاہد، لاہور

---- ○ ----

ایک دوست دوسرے سے : بھئی اپنا وعدہ پورا کرو۔ تم نے تین ماہ قبل یہ کہہ کر مجھ سے سو روپے قرض لئے تھے کہ میرا بیٹا میٹرک کا امتحان دے لے گا تو میں رقم واپس لوٹا دوں گا۔

دوسرا دوست : بھائی میں اپنے وعدے پر قائم ہوں۔ مگر میرے بیٹے کو میٹرک کا امتحان تو دینے دو۔ ابھی تو خیر سے اس نے پہلی جماعت کا امتحان دیا ہے۔"

مرسلہ : روبینہ ناز، مخدوم پور

---- ○ ----

استاد نے شاگرد کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"تم آج پھر اسکول دیر سے آئے ہو۔ آخر تم اپنے پاس الارم گھڑی رکھ کر کیوں نہیں سوتے؟"

شاگرد : "سوتا ہوں سر ---- مگر سر ----

جس وقت اس کا الارم بجتا ہے' اس وقت میں سو رہا ہوتا ہوں سر۔"

---- ○ ----

آثار قدیمہ کا ایک ماہر پرانی چیزوں کی تلاش میں شہر شہر گاؤں گاؤں گھومتا پھر رہا تھا۔ ایک چھوٹے سے گاؤں کی چھوٹی سی دکان پر اس کو ایک بہت پرانے زمانے کا پیالہ نظر آیا۔ جس میں دکان دار کی بلی دودھ پی رہی تھی۔ اس نے سوچا' دکان دار سے پیالہ مانگا تو وہ پیالے کی اہمیت سمجھ جائے گا۔ چنانچہ اس نے بہت اصرار کر کے اس کی بلی پانچ ہزار روپے میں خرید لی۔ بلی خریدنے کے بعد اس نے دکان دار سے کہا۔

"یہ پیالہ بھی دے دو' تمہارے لئے بے کار ہے اور بلی اس کی عادی ہے۔"

دکاندار بولا۔

"میاں بے وقوف کسی اور کو بنانا۔ اس پیالے کی وجہ سے اب تک بیس بلیاں بیچ چکا ہوں۔"

مرسلہ : پروین کنول' خانیوال

---- ○ ----

ایک سیاح ایک گائیڈ کے ساتھ چڑیا گھر کی سیر کر رہا تھا کہ وہ ایک پنجرے کے پاس پہنچا جس میں شیر اور بکری اکٹھے بندھے ہوئے تھے۔ سیاح حیرت سے بولا۔

"واہ وا! پرامن بقائے باہمی کی ایک عمدہ مثال۔ --- لیکن آخر یہ کس طرح ممکن ہے۔"

گائیڈ : وہ اس طرح جناب کہ ہم ہر روز ایک نئی بکری اس پنجرے میں ڈال دیتے ہیں۔"

مرسلہ : گل محمد خان' سوات

---- ○ ----

استاد (شاگرد سے) : کتے پر تم نے جو مضمون لکھا ہے وہ تمہاری بہن کے مضمون جیسا کیوں ہے؟"

شاگرد : اس لئے سر --- کہ ہم دونوں نے ایک ہی کتے پر مضمون لکھا ہے۔

مرسلہ : فوزیہ شمیم' بہاولپور

---- ○ ----

"محترمہ ڈائٹنگ کرتے وقت احتیاط برتیں۔ ڈائٹنگ خطرناک بھی ثابت ہو سکتی ہے۔"

ایک صاحب نے اپنی شناسا خاتون کو مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

"مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک صاحبہ نے مختصر مدت کی ڈائٹنگ کا پروگرام بنایا۔ اس وقت ان کا وزن تین سو پونڈ تھا ---- آٹھ ہفتے بعد جب ان کی ڈائٹنگ کا کورس ختم ہوا تو ان کا وزن صرف پچاس پونڈ رہ گیا تھا' کفن سمیت۔"

مرسلہ : آمنہ افتخار' کوہاٹ

---- ○ ----

قبلہ.. اس سے ٹوٹے ہوئے دل بھی جڑ سکتے ہیں یا نہیں۔ (کراچی کے ہنگاموں پر ایک بچے کا سوال)

ایک صاحب جب دفتر پہنچے تو اپنی گاڑی پر یہ چٹ لکھ کر لگا گئے۔

"مہربانی کرکے وہیل کیپ نہ چُرائیے۔"

تھوڑی دیر بعد واپس آئے تو چاروں وہیل کیپ زمین پر پڑے تھے اور گاڑی غائب تھی۔

مرسلہ : فریال گوہر، کراچی

---- ○ ----

وسیم : مجھے حساب کے استاد بہت پسند ہیں۔

نعیم : وہ کیوں؟

وسیم : اس لئے کہ وہ مجھے بات بات پر کلاس سے نکال دیتے ہیں۔

مرسلہ : عدنان خالق، میرپور

---- ○ ----

پہلا دوست دوسرے دوست سے : "تم نے دیکھا کنڈیکٹر مجھے ایسے گھور رہا تھا۔ جیسے میں بغیر ٹکٹ سفر کر رہا ہوں۔"

دوسرا دوست : "اور تم نے یہ نہیں دیکھا کہ میں کنڈیکٹر کو اس طرح دیکھ رہا تھا، جیسے میں ٹکٹ لے چکا ہوں۔"

مرسلہ: محمد بلال، کراچی

---- ○ ----

کاؤبوائے! "کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ گھوڑا ٹھیک نسل کا ہے؟"

"کیوں نہیں۔ آپ اس بات سے اندازہ لگائیں کہ جب راستے میں کوئی رکاوٹ آجائے، تو پہلے سوار کو پار کراتا ہے۔ پھر خود پار کرتا ہے۔"

مرسلہ: محمود عالم، کراچی

---- ○ ----

بنام آنکھ مچولی

قارئین کے منتخب خطوں کے جواب

ہارون اقبال ملک، میرپور خاص۔ جون کا تازہ شمارہ پڑھا بہت اچھا لگا۔ "فاتح" "بھکاری یا فن کار" "جنت کی کھڑکی" "اچھے بھائی بنے کپتان" "۳۶ گھنٹے لہروں میں" اور "شامت کا مارا" پسند آئیں۔ آمنے سامنے کی جگہ نیا سلسلہ شروع ہو رہا ہے یہ جان کر خوشی ہوئی۔ **محمد عامر علی، کراچی۔** ماہ جون کا رسالہ اپنی مثال آپ تھا۔ ایک ہی دن میں پورا رسالہ پڑھ ڈالا۔ بنام آنکھ مچولی میں اپنا خط دیکھ کر از حد خوشی ہوئی۔ **محمد امین دانش، مکران۔** رسالہ خوبصورت ٹائیٹل کے ساتھ ملا۔ پڑھ کر بے حد مزا آیا۔ "سوتا جاگتا ابوالحسن" قسط وار کہانی بے حد پسند آئی۔ آپ سے درخواست ہے کہ مصوری کا کوئی سلسلہ شروع کریں اور یہ آپ نے سائنسی سوالات کا کالم کیوں بند کر دیا ہے؟ ○ ...... مصوری کا سلسلہ عنقریب شروع کیا جائے گا اسی طرح سائنسی سوالات کے کالم کو نئے انداز سے شروع کیا جائے گا۔ **تنویر حسن، کراچی۔** جون کے شمارے کا سرورق خوبصورت تھا۔ تحریریں تمام ہی منفرد تھیں۔ "سوتا جاگتا ابوالحسن" کی آخری قسط پسند آئی۔ اب آپ جلدی سے کوئی نیا قسط وار ناول شروع کیجئے! ○ ..... "سوتا جاگتا ابوالحسن" کی پسندیدگی کا شکریہ! آپ کی فرمائش اسی مہینے سے پوری کی جا رہی ہے۔ **منیر حسین، کراچی۔** اس بار رسالہ تاخیر سے ملا۔ سرورق بہت ہی عمدہ تھا۔ مضامین میں "ڈاکٹر جان گل کرسٹ"

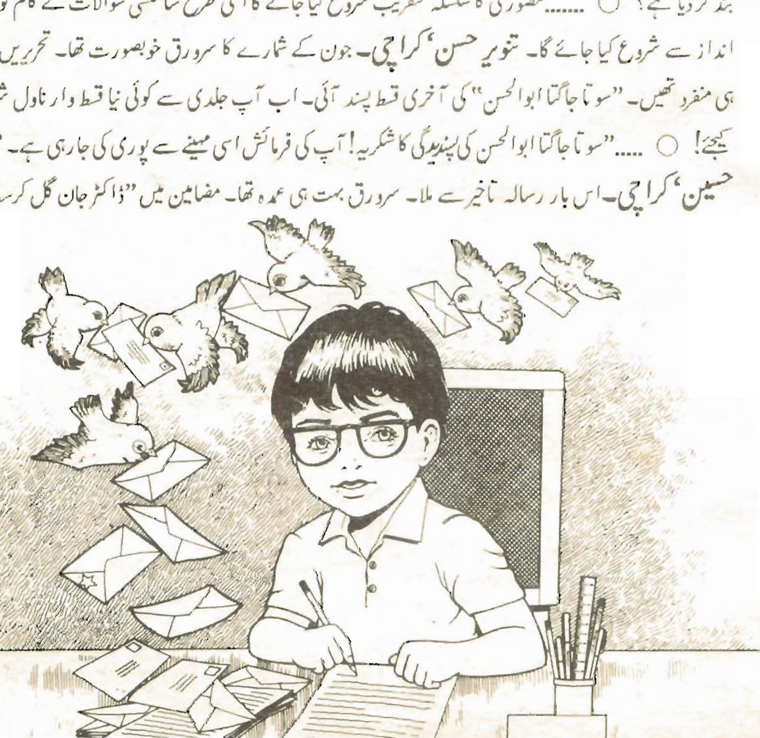

پسند آیا جبکہ کہانیوں میں "سوتا جاگتا ابوالحسن" اور "سیر سوا سیر" لاجواب تحریریں تھیں۔ ترجمہ "۳۶ گھنٹے لہروں میں" پسند آیا۔ **عدیل ستار، کراچی۔** سرورق بالکل اچھا نہیں لگا۔ کہانیوں میں "نومی میاں کا تجربہ" اور "ایک ہفتے کی سزا" پسند آئیں "سوتا جاگتا ابوالحسن" کی آخری قسط شاندار تھی۔ **رابعہ شمیم، کراچی۔** ایک کہانی "رزلٹ" بھیج رہی ہوں آپ اسے اگست میں شائع کر دیجئے کیوں کہ اگست میں میری برتھ ڈے پارٹی ہے۔ یہ ایک طرح سے میرے لئے ایک بہترین سرپرائز ہوگا۔ ○ ...آپ کی کہانی آنکھ مچولی کے معیار پر پوری نہیں اُتری آپ کوئی اور معیاری اور دلچسپ تحریر ارسال کیجئے۔ **شہزاد محمود، کراچی۔** میں حکومتِ پاکستان اور کراچی کی انتظامیہ سے سوال کرنا چاہتا ہوں کہ کب وہ کراچی کے حالات سدھاریں گے؟ کب تک مساجد پر فائرنگ ہوتی رہے گی؟ کب تک دہشت گرد دندناتے پھرتے رہیں گے؟ کراچی کب تک یوں ہی جلتا رہے گا اور کب تک یہاں معصوم اور بے گنا شہری یونہی قتل ہوتے رہیں گے؟ آخر یہ سلسلہ کب ختم ہوگا؟؟؟ ○ ....بھائی شہزاد! کراچی کے حالات پر پورے ملک کے لوگوں کو دکھ ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ کراچی کے حالات سدھار دے۔ بس اب تو اللہ ہی .... حالات سدھار سکتا ہے۔ **پرنس افضل شاہین، بہاول نگر۔** آپ نے مجھے بنام آنکھ مچولی میں پچھلے تین مہینوں سے آؤٹ کیا ہوا ہے...کیا اس کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟ بہرحال جون کا شمارہ پسند آیا۔ "فاتح" "اچھے بھائی بنے کپتان" "شامت کا مارا" اور سیر سوا سیر" پسند آئی۔ **فیصل، کوئٹہ۔** "چھتیس گھنٹے لہروں میں" اور "ایک پاکستان بچے کی تمنا" بے حد پسند آئیں۔ **محمد علی، لالہ موسیٰ۔** علی اکمل تصور کی کہانی "فاتح" اس ماہ کے پھول میں بھی چھپی ہے اس کی کیا وجہ ہے؟ ○ ....اس کی وجہ تو اکمل تصور صاحب ہی بتا سکتے ہیں انہیں ایک وقت میں ایک ہی رسالے میں اپنی تحریر چھپوانی چاہئے۔ **میر شاہ زمان تالپور، میرپور خاص۔** "نومی میاں کا تجربہ" اور "شامت کا مارا" اچھی کہانیاں تھیں۔ اب آپ ایک اور خوفناک نمبر شائع کریں۔ ○ .....آپ کی فرمائش سر آنکھوں پر۔ **سید فرحان احمد، کراچی۔** جون کے شمارے کا شدت سے انتظار تھا جیسے ہی ہاتھ میں آیا سارے کا سارا ہڑپ کر ڈالا بہت مزے دار تھا۔ ○ ......ویسے ہمیں خدشہ ہے کہ آپ کو ہاضمہ کی گولیاں لینا پڑی ہوں گی۔ **محمد رحمت اللہ بشیر قادری، گجرات۔** رسالہ اتنی تاخیر سے ملا کہ بس.... آپ نے ہمارے صبر کا خوب امتحان لیا۔ ماہ جون کا اداریہ پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ جناب آپ کو تو مشوروں کا دفتر کھول لینا چاہئے۔ **جاوید حسین شاہانی بلوچ، دادو۔** شمارہ دیر سے آیا مگر اپنی مثال آپ تھا۔ تمام کہانیاں و مضامین پسند آئے۔ **شہروز علی، گجرانوالہ۔** تازہ شمارہ پڑھا بہت پسند آیا۔ آنکھ مچولی میں کہانیاں لکھنے کے لئے سطر چھوڑنے کی پابندی ختم کر دیجئے۔ میری کہانی "قصبہ" کا کیا بنا؟ ○ .... آپ کی یہ کہانی تو ناقابل اشاعت ہے آپ کوئی اور مختصر اور دلچسپ سی کہانی ارسال کیجئے۔ **دانش جوہر، کندھ کوٹ۔** یہ میرا آخری خط ہے آپ مجھے منانا چاہتے ہیں تو میری تین چار تحریریں شائع کریں۔ ○ ....ناقابل اشاعت تحریریں

شائع نہیں ہوتیں آپ نئی تحریریں ارسال کیجئے۔ **شمائلہ قاسم ' کراچی۔** ایڈیٹر صاحب! خاص نمبر میں آپ نے میری دو تحریریں شائع کیں۔ یہ میری پہلی تحریریں تھیں مجھے یقین نہیں آتا کہ میری نگارشات آپ نے شائع کیں۔ **طاہر ناز انصاری ' دینہ شہر۔** شمارہ بہت ہی خوبصورت اور دلکش تھا۔ تمام تحریریں خاص تھیں۔ **اسید بن زبیر ' کراچی۔** ٹائیٹل بہت اچھا تھا۔ کہانیوں اور نظموں کی الگ الگ تعریف کروں تو خط بہت لمبا ہو جائے گا صرف اتنا کہوں گا کہ شمارہ اپنی مثال آپ تھا۔ **محمد ظفر اللہ ضیا ' کمالیہ۔** آنکھ مچولی پڑھ کر ساری تشنگی جاتی رہی۔ آپ نے میگزین جس محنت سے ترتیب دیا ہے قابل تعریف ہے۔ ہر چیز کی قیمت پہلے سے کئی گنا بڑھ گئی ہے ہمارا تعاون تو یہی ہے کہ آپ جتنی بھی قیمت رکھیں گے جیسے تیسے کر کے اپنے محبوب میگزین کو خریدلیں گے۔ **ارشد نواز ' کوہاٹ۔** شمارہ بہت پسند آیا خاص کر انعامی سلسلے بہت اچھے لگے۔ **تہمینہ عابد ' کراچی۔** خاص نمبر میں عالیہ صلاح الدین کا انٹرویو اور راحت کی کہانیاں بہت اچھی لگیں۔ عبد القادر صاحب کا انٹرویو بھی پسند آیا۔ اب آپ محمد عادل منہاج کا انٹرویو شائع کریں۔ ○ .... آپ کی فرمائش عنقریب پوری کی جائے گی۔ **محمد طاہر ترکمن ' کوئٹہ۔** آپ کا رسالہ پاکستانی بچوں کی علمی و اخلاقی تربیت کر رہا ہے۔ یہ مملکت خداداد پاکستان کے بچوں میں ایک چمکتے دمکتے چاند کی طرح ہے۔ **شبانہ رشید ' کراچی۔** ماہ مئی کے خاص نمبر میں مدیر آنکھ مچولی نے ایک بڑے مسئلے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ یہ افسوس ناک امر ہے کہ بچوں کے رسائل شائع کرنے والے اداروں کو خاصا نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ نہ حکومت ان کی سرپرستی کرتی ہے نہ کوئی دوسرے پرائیویٹ ادارے۔ بچوں کی صحافت میں آنکھ مچولی نے نئی روایات قائم کیں اور منفرد کارنامے سرانجام دیئے اس کے باوجود یہ ایک مستحکم ادارہ نہ بن سکا جو یقیناً" ایک قابل توجہ مسئلہ ہے۔ ہمارے ملک میں بے شمار لوگ ایسے ہیں جو فیکٹریوں 'ملوں اور لاکھوں روپے کے کاروبار کے مالک ہیں' جو بڑے بڑے ادارے چلا رہے ہیں۔ وہ اپنی مصنوعات کی تشہیر پر لاکھوں روپیہ خرچ کرتے ہیں۔ ان کا ایک قومی فرض یہ بھی ہے کہ بچوں کے کام کرنے والے اداروں کی سرپرستی کریں کیوں بچے قوم کا مستقبل ہیں۔ **محمد عثمان بن سلیم ' کراچی۔** ایک ساتھی نے خاص نمبر میں شائع ہونے والی میری کہانی "صحیح فیصلہ" پر تنقیدی تبصرہ کیا ہے۔ بھائی! آپ نے شائد میری کہانی غور سے نہیں پڑھی۔ یہ کوئی من گھڑت کہانی نہیں بلکہ حقیقی واقعہ ہے جسے میں نے کہانی کے طور پر پیش کیا۔ میری کہانی کا کردار کوئی پیشہ ور غنڈہ یا بدمعاش نہیں بلکہ بروں کی صحبت میں رہ کر اس کی یہ حالت ہوئی اور جب اس پر ذرا سی سختی کی گئی تو وہ سدھر گیا۔ یہ بالکل درست بات ہے کہ اوپر سے گیدڑ بھبکیاں دینے والے لوگ اندر سے انتہائی بزدل ہوتے ہیں۔ **محمد جنید ہارون لاکھانی ' کراچی۔** اس بار ماہ رواں کی پہلی بات کا ایک ایک لفظ قابل دید تھا۔ "کونسی ملاوٹ صحیح ہے" میں بتایا گیا کہ استادوں تک کے ذہن پر اپنی قومی زبان چھوڑ کر انگریزی زبان کس بری طرح سوار ہے۔ "ایک ہفتے کی سزا" "فاتح" اور "جنت کی کھڑکی" اچھی تحریریں ثابت ہوئیں جبکہ "نومی میاں کا تجربہ" میں مصنف

نے نہایت بھونڈے انداز میں مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اسی طرح "شامت کا مارا" بھی متاثر نہ کرسکی۔ رسالے میں مضامین کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے کبھی کبھی تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ رسالہ صرف مضامین کے لئے ہی مخصوص ہے۔ **محمد زبیر تبسم' تلہ گنگ۔** آج کل ٹی وی پر گمراہ کن فلمیں' ڈرامے اور موسیقی کے پروگرام پیش کئے جارہے ہیں جو نئی نسل میں بگاڑ کا سبب ہیں کیوں کہ ٹی وی تقریباً" ہر گھر میں ہی موجود ہے۔ ماں باپ' اساتذہ کی جگہ اب ملک کے مستقبل کی تربیت ٹی وی کررہا ہے اور خوب دھڑلے سے پاکستان کا مستقبل تاراج کررہا ہے کیا اربابِ اقتدار اس مسئلے کا کوئی حال ڈھونڈیں گے؟؟ **محمد سہیل' ڈیرہ غازی خان۔** پہلی مرتبہ محفل میں شریک ہورہا ہوں امید ہے رسالے میں جگہ دیں گے۔ **پاکیزہ اصلاح' منڈی بہاؤالدین۔** مجھے آنکھ مچولی بہت اچھا لگتا ہے۔ میری لکھائی صاف ستھری نہیں کوئی غلطی ہوجائے تو معاف کردیجئے گا۔ ○ ---- آپ کی لکھائی ہم سے بہت اچھی ہے ہمارا لکھا ہوا تو لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا۔ **سید فرحان' سید کامران' حیدر آباد۔** سرورق بہت ہی اچھا لگا۔ کہانیاں سب معیاری اور جاندار تھیں لطیفے بھی پسند آئے۔ ہم نے ایک عدد کہانی روانہ کرنے کی اجازت مانگی تھی لیکن آپ نے کوئی جواب ہی نہ دیا؟ ○ ---- نگارشات روانہ کرنے کے لئے آپ کو ہماری اجازت کی قطعا" ضرورت نہیں جیسے ہی کوئی آئیڈیا آپ کے دماغ میں آئے اسے کاغذ پر منتقل کرکے فورا" ہمیں روانہ کردیجئے لیکن یہ بات یاد رکھئے کہ تحریر دلچسپ' معیاری اور آپ ہی کی ہو۔ **عبدالقدیر انڈھڑ' پنوں عاقل۔** خاص نمبر کافی لیٹ ملا اس لئے مقابلوں میں دیر سے شامل ہورہا ہوں۔ خاص نمبر بہت پسند آیا۔ **سعدیہ شارق' کراچی۔** تمام تحریریں مزے دار تھیں خاص کر "اداس لڑکا اور مہمان" بہت پسند آئیں نظمیں ساری اچھی تھیں۔ **ریاض راہی برڑو' ٹنڈو محمد خان۔**

آپ ہماری کوئی تحریر شائع نہیں کرتے اس لئے کہ ہم غریب ہیں کیا یہ ہمارا رسالہ نہیں؟ ○ ---- اچھے بھائی! ہمت' حوصلہ اور اچھی سوچ رکھنے والے کبھی غریب نہیں ہوتے ان کی لغت میں "مایوسی" کا لفظ بھی نہیں ہوتا۔ وہ گرجائیں تو انہیں اٹھنا بھی آتا ہے یہ آپ کا ہی رسالہ ہے آپ دلچسپ اور معیاری تحریریں ارسال کیجئے **ایم معروف گلاب' کراچی۔** آنکھ مچولی ہم تمام گھر والوں کی آنکھ کا تارا ہے جس سے ہر ماہ ہماری خوشیوں میں اضافہ ہوجاتا ہے۔

اُداس بستی

مجاھد حسین باسط (مرحوم)

ظلمتوں کے طفیل کب سے **گلاب** بستی اُداس بستی بنی ہوئی ہے
اُداس صبحیں اُداس شامیں، اداس نغمے اُداس تانیں
اُداسیوں کا نگر پہ جادو چلا چکا ہے ذلیل ہندو
اسے خبر کیا کہ زندگی میں اُداسیوں کا عروج کچھ بھی نہ کر سکے گا
مجاہدوں کے عزم کو ظالم
کبھی بھی دھیما نہ کر سکے گا
خدا کا آئین پڑھنے والے یہ جانتے ہیں کہ زندگی میں
اُداسیوں کا قیام جتنا طویل ہو گا، عظیم لوگوں کی منزلوں کا
حصول اتنا آسان ہو گا
کشمیریو! تم عظیم تر ہو
تمہارا سورج اُبھر رہا ہے
اُبھر رہا ہے.....!!!

اب میں کیا کروں؟

میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے بچوں کے رسالے اور کہانیوں کی کتابیں پڑھنے کا بے انتہا شوق ہے۔ میں جیب خرچ میں سے پیسے بچا بچا کر رکھتا ہوں اور پھر ان سے رسالے خرید تا ہوں۔ لیکن ابو کا خیال ہے کہ مجھے اپنی توجہ صرف تعلیم پر دینی چاہئے۔ کیونکہ اسکول کی پڑھائی کر کے ہی میں میٹرک میں اچھی ڈویژن لا سکتا ہوں۔ ایسا نہیں ہے کہ میں اسکول کی پڑھائی میں دل نہیں لگاتا۔ اس کے باوجود جب بھی وہ مجھے کبھی کوئی رسالہ یا کہانیوں کی کتاب پڑھتے دیکھتے ہیں تو چھین لیتے ہیں اور کہتے ہیں فضول چیزیں کیوں پڑھتے رہتے ہو۔ وقت ضائع کرنے کا کیا فائدہ۔ میں انہیں کیسے سمجھاؤں کہ یہ فضول چیز نہیں ہے۔ ان رسالوں میں معلوماتی مضامین بھی ہوتے ہیں۔ ابو نہیں سمجھتے اور ان کے کئی بار منع کرنے کے باوجود جب میں نے رسالوں کا مطالعہ نہیں چھوڑا تو ایک بار انھوں نے میری پٹائی بھی کی اور سختی سے کہا کہ آئندہ یہ خرافات مجھے نظر نہیں آنا چاہئیں۔ ان کے اس رویّے سے میرا دل اسکول کی پڑھائی سے بھی اُچاٹ ہو گیا ہے۔ رسالے اور کہانیاں پڑھنے کا دل پہلے سے زیادہ چاہنے لگا ہے لیکن ابو کے خوف سے انہیں ہاتھ لگاتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ آپ ہی بتائیے میں ابو کو کیسے سمجھاؤں؟

(ل'ک۔اسلام آباد)

اب ہم یہ کریں گے

"اب میں کیا کروں" آنکھ مچولی کا منفرد اور مقبول سلسلہ ہے۔ جس میں بچے اپنے مسائل بیان کرتے ہیں اور بچے ہی ان کے حل تجویز کرتے ہیں۔ ہمیں ہر ماہ سینکڑوں خطوط ملتے ہیں جن میں بڑے دلکش اور مؤثر انداز میں مسئلہ کا حل بیان کیا گیا ہوتا ہے۔ مگر تاخیر سے موصول ہونے کی وجہ سے یہ حل مقابلے میں شامل نہیں ہوتے۔ اسی لئے اس ماہ سے ہم نے مقابلے میں شرکت کی تاریخ ماہ رواں کی ۱۰ سے بڑھا کر ۳۰ کر دی ہے۔ جون ۹۵ء میں شائع ہونے والے مسئلے کا حل اگست ۹۵ء کے شمارے میں شائع کیا جائے گا۔ اور جولائی میں شائع ہونے والے مسئلے کا حل ستمبر ۹۵ء میں۔ (ادارہ)

عوام کی خدمت

بختیار احمد

شہر کا مرکزی چوک لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ آس پاس کی سڑک پر بھی لوگوں کا جم غفیر نظر آرہا تھا۔ الیکشن میں تھوڑے ہی دن رہ گئے تھے اس لئے ہر سیاسی جماعت شہر میں بڑے بڑے جلسے کرا رہی تھی۔ اس سلسلے میں آج ملک کی ایک بڑی سیاسی جماعت کا جلسہ عام شہر کے مرکزی چوک میں ہو رہا تھا جس میں دوسرے لیڈروں کے علاوہ پارٹی کے سربراہ جنید کاجانی کو بھی خطاب کرنا تھا۔ دوپہر تک سڑک اور چوک لوگوں سے بھر چکا تھا حالانکہ جلسہ کی کارروائی شام سات بجے شروع ہونی تھی۔ اب چوک کے سامنے والی سڑک پر کسی بھی قسم کے ٹریفک کا گزرنا ناممکن تھا۔ دکانیں بھی تمام بند ہو چکی تھیں۔ پارٹی کے کارکنوں کا جوش و خروش عروج پر تھا۔ انہوں نے اپنی پارٹی کے جھنڈے اور جنید کاجانی کی تصاویر اٹھا رکھی تھی اور وہ اپنے لیڈروں کے حق میں نعرے لگا رہے تھے۔

ارمغان کرسی پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ آج وہ کالج نہیں گیا کیونکہ آج شام ان کے گھر کے بالکل سامنے شہر کے مرکزی چوک میں ایک سیاسی پارٹی کا جلسہ ہو رہا تھا۔ اسٹیج چونکہ کل ہی سے چوک میں لگ چکا تھا اور اس کا رخ ان کے گھر والی سڑک پر تھا اس لئے اس نے سوچا کہ جلسہ میں شریک ہونے والے اسی سڑک پر جمع ہوں گے جس پر اس کا گھر واقع ہے اس طرح گھر پہنچنے میں دقت ہوگی۔ اس کا خیال درست نکلا۔ دوپہر ہی سے سڑک پارٹی کے کارکنوں سے کھچا کھچ بھر گئی تھی ارمغان اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کے ابو جمیل صاحب کی ایک بہت بڑی فرنیچر کی دکان تھی۔ وہ بھی آج دکان پر نہیں گئے تھے کیونکہ ایک تو ان کو رش ویسے بھی پسند نہیں تھا اور پھر وہ دل کے مریض بھی تھے ان کو ایک بار ہارٹ اٹیک ہو چکا تھا۔ جلسے کی کارروائی شروع

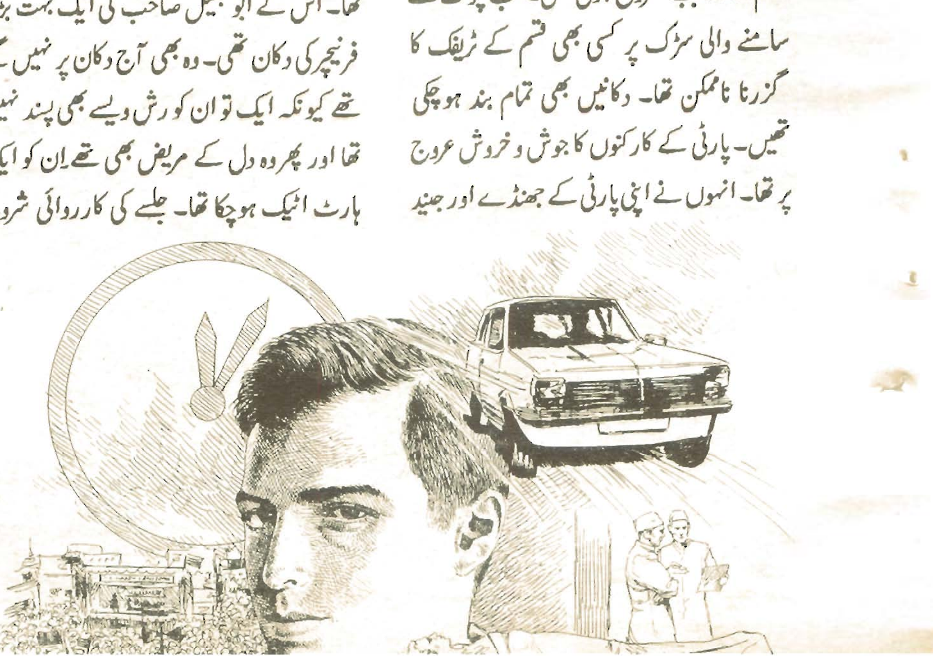

ہو چکی تھی چوک میں اور سڑک پر جگہ جگہ لاؤڈ اسپیکر لگے ہوئے تھے جس کی وجہ سے تقریروں کی آواز کمرے میں پوری قوت سے آرہی تھی۔

"کب ختم ہوگا یہ جلسہ؟" ارمغان ناگواری سے بولا اس کے ابو نے جو پاس بیٹھے کتاب پڑھ رہے تھے کتاب سے نظریں ہٹا کر ہاتھ پر بندھی گھڑی کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بولے "ابھی تو نو ہی بجے ہیں اور جلسہ تو آدھی رات سے پہلے ختم نہیں ہوتا۔" "اف کیا مصیبت ہے!" ارمغان بولا"اِن کو کوئی گراؤنڈ کوئی کھلی جگہ نہیں ملتی جو سڑکوں پر جلسہ کرتے ہیں۔"

اس کے ابو کچھ کہنے والے تھے کہ ارمغان کی امی نے دوسرے کمرے سے آواز دی "آجائیں کھانا چن دیا گیا ہے۔" وہ اٹھے اور دوسرے کمرے کی طرف چلے پڑے۔

ارمغان کھانا کھا کر دوسری منزل پر اپنے کمرے میں آگیا اس نے کھڑکی کھولی اور نیچے دیکھنے لگا۔ یہاں سے جلسہ کا منظر صاف نظر آرہا تھا۔ سڑک لوگوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ چوک کے بیچ میں ایک شاندار اسٹیج بنا ہوا تھا اسٹیج کو پارٹی کے جھنڈوں اور جنید کاجانی کی تصویروں سے سجایا گیا تھا۔ اسٹیج پر بہت سے بلب اور ٹیوب لائٹس جل رہی تھیں جس سے اسٹیج روشنی میں نہا گیا تھا۔ جنید کاجانی پارٹی کے دوسرے راہنماؤں کے ساتھ اسٹیج پر صوفے پر بیٹھا ہوا تھا جب کہ ایک لیڈر تقریر کررہا تھا۔ ارمغان نے سوچا کہ تھوڑی دیر جلسے کی کارروائی ہی دیکھ لی جائے۔چنانچہ وہ کرسی گھسیٹ کر کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا۔ اچانک نیچے سے اس کی امی کی چیخنے کی آواز آئی "ارمغان، ارمغان نیچے آؤ۔"

ارمغان جلدی سے اٹھا اور نیچے بھاگا۔ نیچے کمرے میں اس کے ابو کرسی پر بیٹھے اپنا سینہ ایک ہاتھ سے پکڑے کراہ رہے تھے۔ اس کی امی ان کے پاس کھڑی تھیں۔ "دیکھو ارمغان --- -" وہ گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ارمغان انہیں دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ انہیں ہارٹ اٹیک ہوا ہے کیونکہ پہلی دفعہ بھی انہیں ارمغان کے سامنے ہی ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ وہ بولا "امی میں گاڑی نکالتا ہوں فوراً" ہسپتال چلتے ہیں۔" اور امی کا جواب سنے بغیر اس نے سامنے میز سے گاڑی کی چابی اٹھائی اور باہر بھاگا اس نے جلدی سے گھر کا گیٹ کھولا گاڑی اسٹارٹ کر کے کمرے کے دروازے کے سامنے کھڑی کی اور بھاگتا ہوا اندر گیا۔ "دیکھو ارمغان یہ بے ہوش ہوگئے۔" اس کی امی گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ارمغان نے دیکھا اس کے ابو کرسی پر بے ہوش پڑے تھے۔ "آپ فکر نہ کریں سب ٹھیک ہوجائے گا۔" ارمغان بولا۔ ارمغان بھی گھبرا رہا تھا مگر اس نے اپنی گھبراہٹ ظاہر نہ ہونے دی۔ ان دونوں نے جمیل صاحب کو سہارا دے کر گاڑی کی پچھلی

سیٹ پر ڈالا۔ ارمغان کی امی بھی ان کے ساتھ بیٹھ گئی۔ ارمغان ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور گاڑی اسٹارٹ کردی۔ ہسپتال ان کے گھر سے چار کلو میٹر کے فاصلے پر تھا اور گاڑی میں وہاں باآسانی پانچ منٹ میں پہنچا جاسکتا تھا۔ ارمغان نے جیسے ہی گاڑی سڑک پر نکالی اسی لمحے جنید کاجانی تقریر کرنے اسٹیج پر کھڑا ہوا۔ پوری جلسہ گاہ جنید کاجانی زندہ باد اور تالیوں کی آواز سے گونج اٹھی۔ اب سامنے سڑک تو ساری لوگوں سے بھری ہوئی تھی۔ ارمغان مسلسل ہارن بجارہا تھا اور ساتھ ہی چیخ رہا تھا۔"ہٹو ہم مریض کو ہسپتال لے جا رہے ہیں۔" مگر تالیوں اور نعروں کے شور میں کوئی اس کی آواز نہیں سن رہا تھا۔ جو تین چار آدمی گاڑی کے بالکل سامنے ہوتے وہ آگے سے ہٹ جاتے مگر ان سے آگے کھڑے لوگوں کو متوجہ ہونے اور آگے سے ہٹنے میں ایک آدھ منٹ لگ جاتا اور گاڑی تھوڑی اور آگے بڑھتی۔ پچھلے سیٹ سے اس کی امی مسلسل چیخ رہی تھیں "جلدی کرو ارمغان۔" ان کے گھر سے چوک تک تقریباً" ایک کلو میٹر سڑک اسی طرح لوگوں سے بھری ہوئی تھی۔ ارمغان مسلسل چیخ رہا تھا۔ "خدا کے لئے آگے سے ہٹو ہمیں ہسپتال پہنچنا ہے۔" آخر خدا خدا کر کے ایک کلومیٹر کا یہ فاصلہ پندرہ منٹ میں طے ہوا۔ آگے سڑک صاف تھی۔ ارمغان نے گاڑی پوری رفتار پر ڈال دی اور اگلے تین کلو میٹر صرف تین منٹ میں طے کرتے ہوئے گاڑی ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ کے سامنے روکی اور چیخ چیخ کر ڈاکٹر کو بلانے لگا۔ فوراً" ہی عملے کے دو افراد اسٹریچر لے کر آئے۔ وہ اس پر جمیل صاحب کو ڈال کر اندر لے جانے لگے جبکہ ارمغان اور اس کی امی اُن کے پیچھے چلنے لگے اندر ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر ان کی طرف بڑھا۔"کیا ہوا انہیں؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔ "ڈاکٹر صاحب انہیں ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔" ارمغان گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ڈاکٹر نے جمیل صاحب کو چیک کیا اور پھر آہستہ سے سر ہلاتے ہوئے بولا "مجھے افسوس ہے یہ اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ اگر آپ انہیں پانچ منٹ پہلے لے آتے تو شاید ہم انہیں بچالیتے۔"

"یہ سن کر ارمغان کی امی چلائیں اور بے ہوش ہو گئیں ڈاکٹر ان کی طرف متوجہ ہوا۔ ارمغان وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ رات کی خاموشی میں جنید کاجانی کی تقریر جاری تھی وہ کہہ رہا تھا۔ "آپ مجھے خدمت کا موقع تو دیں پھر دیکھئے کہ عوام کے مسائل کس طرح حل ہوتے ہیں۔ اس ملک کے کسی شہری کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔۔۔"

☆

حل کا حل

آنکھ مچولی کے خاص نمبر میں بچوں کے مقبول ادیب جناب اشتیاق احمد کی کہانی "حل" شائع کی گئی تھی اور قارئین کو دعوت دی گئی تھی کہ اس کہانی میں مصنف نے جو حل بتایا ہے اس کے علاوہ بہترین حل بتانے والے کو انعام دیا جائے گا۔ اس سلسلے میں ہمیں بڑے اچھے اچھے حل موصول ہوئے۔ کہانی کا مسئلہ بس اتنا سا تھا کہ ایک چوکیدار اپنی چہیتی بچی کی فرمائش پوری کرنے کے لئے ایک گھر سے کھلونے چُراتا ہے۔ گھر والوں کو اس کا علم ہو جاتا ہے۔ گھر والے کافی غور و خوض کے بعد یہ طے کرتے ہیں کہ چوکیدار صداقت بابا کو کھلونے چرانے سے نہ روکا جائے تاکہ اس کی بچی خوش باش رہ سکے۔ زیادہ تر حل بتانے والوں نے جناب اشتیاق احمد کے اس حل کو نامناسب اور غیر اسلامی بتایا ہے۔ بہترین حل جس کا انتخاب کیا گیا ہے۔ درج ذیل ہے۔

ڈیر انکل اشتیاق احمد! السلام علیکم

آپ نے اپنی کہانی "حل" میں یہ حل پیش کیا ہے کہ صداقت بابا کو چوری کرنے دی جائے۔ مجھے اس حل سے اختلاف ہے۔ اسلام میں تو چور کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ صداقت بابا اپنی بیٹی کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا اور اس نے اپنی بیٹی کی خواہش پوری کرنے کے لئے چوری کی لیکن اگر ایک چور اس لئے کسی کے گھر سے کھلونے چوری کرتا ہے کہ اس کی اپنی بچی کے پاس کھیلنے کے لئے کھلونے نہیں ہیں تو ظاہر سی بات ہے کہ صرف اس وجہ سے چور کو معاف نہیں کیا جاسکتا۔ صداقت بابا کو جو پہلے ہی چوری کر کے اپنے گناہ لکھوا چکا ہے اس حل کے ذریعے چوری کرنے کا مزید موقع فراہم کیا جارہا ہے یعنی اس کے گناہ میں مزید اضافہ ہوگا۔ میرے خیال میں اس کا بہترین حل یہ ہے کہ بچوں کے والد صاحب صداقت بابا کو بتادیں کہ انہیں اس کی چوری کا علم ہو چکا ہے اور یہ بھی بتایا جائے کہ اسلام چور کے متعلق کیا حکم دیتا ہے اور یہ بھی کہا جائے کہ اس نے اب تک جو گناہ کیا ہے، اسے اللہ تعالیٰ سے اس کی معافی مانگنی چاہئے۔ اگر یہ سب باتیں صداقت بابا کو بتانے سے اس کی نظریں نیچی ہوتی ہیں تو یہ نظریں نیچی ہونا اس عذاب سے کئی گنا بہتر ہوں گی جو اسے چوری کرنے کی وجہ سے آخرت میں بھگتنا پڑے گا۔ اس کے علاوہ چونکہ بچے اپنے

کھلونے صداقت بابا کی بیٹی کو دینے کے لئے راضی ہیں لہٰذا بچے اپنے کھلونے اسے تحفے میں دے دیں کیونکہ اسلام بھی ہمیں ایک دوسرے کو تحائف دینے کے لئے کہتا ہے۔

(عقیلہ رشید' لاہور)

جن ساتھیوں نے اپنے حل ارسال کیے

ملک وسیم راجہ' بہاول پور۔ نادیہ سید' گجرات۔ محمد ظفر اللہ ضیاء' کمالیہ۔ نعمان احمد' ساہیوال۔ اکرم فدا' گوادر۔ ہما نصیر' دینہ ضلع جہلم۔ طلحہ آفتاب' کراچی۔ علی خان' بہاول پور۔ صفیہ یوسف' سوات۔ محمد امین دانش' مکران۔ وقاص جاوید' جہانیاں۔ صباحت حبیب خان' کراچی۔ چمن علی شاہ' لاہور۔ داؤد اقبال' نوشہرہ۔ منوج کمار بجانی' حیدر آباد۔ محمد رحمت اللہ بشیر قادری' گجرات۔ فریحہ مظہر' کراچی۔ سبین مہ نور جعفری' ضلع گجرات۔ تنویر بخش' کراچی۔ طارق علی یوسفی' لطیف آباد۔ افشاں غفار' کراچی۔ عاصم خان' کراچی۔ محمد راحیل بن یحییٰ' حیدر آباد۔ عبدالقدیر انڈھڑ' پنوں عاقل۔ عبیداللہ صدیقی' کراچی۔ سیدہ افشاں افتخار' کراچی۔ محمد سلیم خان' کراچی۔ عنبرین آمنہ صدیقی' جام شورو' سندھ۔ نیلو فر' قندیل' کمالیہ۔ طارق محمود' راولپنڈی۔ تہمینہ عابد' کراچی۔ ارم محمد شریف کھتری' کراچی۔ سعدیہ نورین' واہ کینٹ۔

عربی ادب سے

نیا سلسلے وار ناول

کہانی انسان کی

اسحاق منصوری

اس ماہ سے ہم آپ کے لئے ایک نیا سلسلہ وار ناول شروع کر رہے ہیں۔ یہ ایک عجیب و غریب ناول ہے۔ اس میں ایک نوجوان "حیّ" کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ "حیّ" ناول کا ہیرو ہے۔ لیکن اس کردار کے بہانے انسان کی اپنی کہانی اس ناول کا موضوع ہے۔ انسان نے پہلے پہل اس کائنات کو کیسے دیکھا؟ اور چیزوں کو سمجھنے میں عقل نے اس کی رہنمائی کس طرح کی؟ یہ سب باتیں نہایت دل چسپ انداز میں اس ناول میں بیان کی گئی ہیں۔ جناب پروفیسر اسحاق منصوری نے آنکھ مچولی' کے لئے خاص طور پر اس ناول کو عربی زبان سے اردو میں ترجمہ کیا ہے جس کے لئے ہم ان کے بے حد شکر گزار ہیں۔ پروفیسر منصوری جامعہ کراچی میں شعبہ عربی سے وابستہ ہیں۔ (ادارہ)

کیا آپ کو جزائرِ وقواق کی خبر ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ آپ میں سے کسی نے بھی انہیں نہیں دیکھا البتہ کچھ سنا ضرور ہوگا۔ اور آپ میں سے کچھ بچوں نے ان کے بارے میں قصے کہانیوں میں کچھ پڑھا بھی ہوگا۔ میں نے یہ کوشش کی ہے کہ ان جزیروں کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کروں۔ میرے علاوہ اور بھی بہت سے لوگوں نے ان تک پہنچنے کی اور ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں اس کوشش میں کامیاب ہوا نہ دوسرے لوگ ہی ان جزیروں تک پہنچ سکے۔ ان جزیروں تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ خیالی

جزیرے ہیں۔ جن کا اس دنیا میں کچھ وجود نہیں۔ البتہ قصے کہانیوں میں اور خیالی دنیا میں ان کا بڑا چرچا ہے۔

کچھ پرانے زمانے کے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ واقواق کے جزیرے خط استواء کے نیچے واقع ہیں اور ان جزیروں میں ایک ایسا بھی جزیرہ ہے کہ جس میں بغیر ماں اور باپ کے بچے پیدا ہوتے ہیں۔

ان میں سے کچھ لوگوں کا یہ خیال ہے جس کی ان کے پاس کوئی دلیل نہیں کہ واقواق میں ایک جزیرہ ہے جہاں ایسے عجیب وغریب درخت ہیں جن میں پھل وغیرہ پیدا نہیں ہوتے۔ جیسا کہ تمام درختوں میں پھل لگتے ہیں بلکہ وہاں کے درختوں میں صرف عورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اور ان عورتوں کو جو ان درختوں سے پیدا ہوتی ہیں، "واقواق کی کنیزیں" کہا جاتا ہے اور کچھ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ان جزیروں میں ایک ایسا بھی جزیرہ ہے جس کے درختوں سے عورتوں کے بجائے صرف مرد پیدا ہوتے ہیں۔

اسی طرح کچھ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ ان عجیب وغریب جزیروں میں سے ایک جزیرے میں اس کہانی کا ہیرو بغیر ماں اور باپ کے پیدا ہوا تھا اور اسی طرح ان کی باتیں کچھ کہانی لکھنے والوں نے بیان کی ہیں۔ لیکن زیادہ تر تحقیق کرنے والوں نے ان خیالی باتوں کو سچ نہیں مانا بلکہ وہ حقیقت کی تلاش میں لگے رہے یہاں تک انہیں یہ عجیب وغریب کہانی ملی جس میں بچوں کی دلچسپی کا سامان بھی ہے اور ایسی باتیں ہیں جو ان کی معلومات میں اضافہ کرتی ہیں۔ اب میں تمہیں یہ کہانی سنا رہا ہوں۔

پہلا باب :
بہادر انسان کی پیدائش

برعظیم' کے بے شمار جزیروں کے درمیان ایک بہت بڑا جزیرہ تھا۔ اس جزیرے پر انسانوں کی آبادی تھی۔ انہی میں سے ایک شخص ان کا بادشاہ تھا۔ یہ بادشاہ بہت مغرور اور خود پسند تھا۔ اس کی ایک بہن تھی۔ جو بہت ہی خوبصورت تھی۔ بادشاہ اپنے غرور اور تکبر کی وجہ سے اپنی بہن کی اپنی رعایا میں سے کسی سے بھی شادی نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ پھر اسے اپنے بہنوئی کی عزت کرنی پڑتی اور جس طرح وہ جزیرے کے دوسرے لوگوں پر ظلم کرتا تھا۔ اپنے بہنوئی پر ظلم نہیں کر سکتا تھا۔

بادشاہ کی بہن کا ایک رشتہ دار تھا جس کا نام یقظان تھا۔ وہ بہت ہی نیک انسان تھا اور بہترین اخلاق کا مالک تھا۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ بادشاہ کو ایک جنگ کے لئے بہت دور جانا پڑا۔ کئی مہینے گزر جانے کے باوجود جب بادشاہ واپس نہیں آیا تو اس کے گھر والوں نے سوچا کہ بادشاہ مرگیا ہے یا کسی

جنگ میں قتل کردیا گیا ہے یہ سوچ کر بادشاہ کی بہن کے گھر والوں نے لڑکی کی شادی یقظان کے ساتھ کردی البتہ یہ شادی خفیہ طور پر ہوئی اور کسی کو اس کی مطلق خبر نہ ہوئی۔ سال کے بعد ان کے گھر ایک بچہ پیدا ہوا جس کے چہرہ سے ذہانت اور عقل مندی ٹپکتی تھی وہ بچہ بہت خوبصورت بھی تھا۔ اس کی ماں اسے بڑے پیار سے دودھ پلاتی اور سارا دن اس کے ساتھ کھیلتی رہتی۔ ابھی چند ہی دن گزرے تھے کہ اس کا بھائی (بادشاہ) اپنی جنگوں سے کامیاب و کامران واپس آگیا۔ اب کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی، نہ بادشاہ کے رشتہ داروں میں اور نہ ہی اس کی بہن میں کہ وہ بادشاہ کو اس خفیہ شادی کے بارے میں بتاسکے۔ جوکہ اس کی غیر موجودگی میں کردی گئی تھی۔ کیونکہ لوگ اس کے غصے سے خوف زدہ تھے اور اس کے ظلم اور انتقام سے ڈرتے تھے۔ بچے کو اس کی ماں نے اپنے گھر میں چھپا رکھا تھا لیکن وہ ہروقت ڈرتی رہتی تھی کہ پتہ نہیں کس وقت یہ راز فاش ہوجائے اور اس کا بھائی (بادشاہ) اسے اور اس کے بچے کو قتل کرڈالے۔ وہ اسی سوچ میں پریشان تھی کہ اس راز کو زیادہ دیر تک چھپایا نہیں جاسکتا اور اس پریشانی سے کس طرح نجات حاصل کی جائے۔ اس مصیبت سے نکلنے کی اسے یہ صورت نظر آئی کہ اس بدنصیب بچے کو اس جزیرے سے بہت دور بھیج دیا جائے تاکہ بُرے انجام سے بچ جائے۔

ایک دن ماں نے بچے کو دودھ پلایا پھر اسے بڑے پیار و محبت سے ایک صندوق میں بند کردیا اور اس صندوق کو اچھی طرح بند کیا اور اسے پوشیدہ طور پر سمندر کے کنارے لے گئی اور اس صندوق کو سمندر کی موجوں میں ڈالنے کا فیصلہ کرلیا۔ محبت کے باعث اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ غم کے مارے اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ اس نے بچے کا نام حیّ (زندہ) رکھا تاکہ اللہ اسے زندگی عطا کرے۔ پھر اسے یہ کہتے ہوئے سمندر کی موجوں پر رکھا کہ "اے اللہ! بے شک آپ نے اس بچے کو وجود بخشا جبکہ اس دنیا میں اس کا نام ونشان بھی نہیں تھا آپ نے اسے ہر تکلیف سے بچا کر رکھا۔ آپ نے اس کی ہر ضرورت کو پورا کیا میں اب اسے آپ ہی کے حوالے کررہی ہوں کہ اب آپ ہی اس پر اپنا لطف و کرم کریں گے۔ میں آپ کے فضل اور نعمت کی امیدوار ہوں۔ اس سمندر میں، میں اسے اس ظالم اور جابر بادشاہ کے ڈر سے ڈال رہی ہوں۔ اے میرے پروردگار! اے سب سے زیادہ رحم کرنے والی ہستی، اب اسے کسی ایسے شخص کے حوالے نہ کرنا جو اس پر رحم نہ

کرے۔"

پھر اس عورت نے اس صندوق کو سمندر میں ڈال دیا۔ پھر ایسا ہوا کہ پانی کا ایک ریلا آیا اور اسی رات اس صندوق کو پانی کی موج جزیرہ واقواق کے ساحل پر لے گئی۔ پانی سال میں ایک مرتبہ ہی اتنی دور تک جاتا تھا۔ پانی نے اسے ایک ایسے جنگل میں ڈال دیا تھا۔ جس میں بے شمار درخت تھے جس کی مٹی بہت زیادہ زرخیز تھی اور گھنے درختوں کی وجہ سے نہ وہاں سورج کی روشنی پہنچتی تھی اور نہ ہی بارش کا پانی پہنچ پاتا تھا۔ یہ صندوق کچھ دنوں تک اسی طرح پڑا رہا۔ سمندر کے پانی کی وجہ سے اس کی کیلوں کو زنگ لگ گیا اور لکڑیاں کمزور پڑ گئیں۔ جب بچے کو زور کی بھوک لگی تو وہ چیخنے چلانے لگا اور صندوق میں بے چینی سے اچھلنے لگا۔ اس کے اس رونے کی آواز اس ہرنی کے کانوں میں پڑی جس کا بچہ گم ہو چکا تھا۔

دراصل ہرنی کے بچے کو ایک عقاب اٹھا لے گیا تھا جبکہ ایک دن وہ اپنے گھر میں اپنی ماں (ہرنی) کو بتائے بغیر جنگل میں کھیلنے چلا گیا۔ ہرنی اپنے اسی بچے کی تلاش میں تھی۔ اس نے جب بچے کی چیخیں سنیں تو اس نے سوچا شاید یہ میرے اسی گم شدہ بچے کی چیخیں ہوں۔ جہاں سے آواز آ رہی تھی وہ اسی جانب چل دی۔ یہاں تک کہ اس صندوق تک پہنچ گئی جس میں بچہ رو رہا تھا۔ کچھ ہرنی کی کوششوں سے اور کچھ بچے کے ہاتھ پاؤں مارنے سے صندوق کا ڈھکن کھل گیا۔ پہلے تو ہرنی کو حیرت ہوئی روتے ہوئے بچے کو دیکھ کر اس کی محبت جاگ اٹھی۔ وہ بچے کو چومنے چاٹنے لگی اور اسے اپنے سینے سے چمٹالیا اور انتہائی پیار سے اسے اپنا دودھ پلایا اب تو اس کا یہ معمول بن گیا کہ وہ بچے کا ہر طرح سے خیال رکھتی اور اسے ہر تکلیف سے محفوظ رکھتی۔ یہ ہرنی جو بچے کی پرورش کر رہی تھی ایک انتہائی زرخیز زمین اور سرسبز و شاداب چراہ گاہ میں رہتی تھی۔ جہاں ہرنی کے کھانے کے لئے گھاس بہت زیادہ تھی اور بے شمار قسم کے درخت بھی تھے اس طرح سے وہ ہرنی بہت ہی صحت مند ہو گئی اور اس کا دودھ بھی بہت بڑھ گیا۔ اس طرح یہ ہرنی بچے کو خوب دودھ پلاتی اور ہر وقت بچے کے آس پاس ہی گھومتی رہتی تھی صرف کبھی کبھی کچھ چرنے چگنے کے لئے ذرا دور نکل جاتی لیکن فوراً ہی واپس آجاتی۔

دو سال کے بعد

بچے کو ہرنی سے اتنی محبت ہو گئی کہ وہ تھوڑی دیر کے لئے بھی ہرنی کی جدائی برداشت نہیں کر سکتا تھا جب کبھی ہرنی تھوڑی دیر کے لئے دور چلی جاتی تو بچہ زور زور سے رونے لگتا تو مہربان ہرنی اس کے رونے کی آواز سن کر فوراً

اس کے پاس چلی آتی۔ اتفاق سے اس جزیرے میں شیر و چیتے جیسا کوئی درندہ نہیں تھا اس لئے بچہ امن وامان سے بڑھتا رہا اور اپنی ماں کے دودھ سے پروان چڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کی عمر دو سال ہو گئی۔

اب بچہ چلنے پھرنے لگا۔ اس کے دانت بھی نکل آئے تھے۔ جہاں ہرنی جاتی بچہ بھی اس کے پیچھے پیچھے جاتا۔ ہرنی بچے سے بہت پیار کرتی تھی اور اسے ایسی جگہ لے جاتی تھی جہاں بہت زیادہ پھل دار درخت ہوتے تھے۔ پکے ہوئے میٹھے میٹھے پھل درختوں سے نیچے گر جاتے ہرنی اپنے بچے کو کھلاتی تھی۔ ان پھلوں میں سے جن کا چھلکا سخت ہوتا انہیں سخت دانتوں سے توڑ دیتی اور جب بچہ دودھ پینا چاہتا تو اسے خوب دودھ پلاتی تھی اور جب پیاسا ہوتا تو اسے پانی پر لے جاتی۔ جب دھوپ اسے تنگ کرتی تو وہ اس پر سایہ کر دیتی تھی۔ جب اسے سردی لگتی تو اسے اپنے سینے سے چمٹالیتی، سلاتی۔ جنگل میں صبح شام آتے جاتے جنگلی گائے کے ایک ریوڑ سے ان کی دوستی ہو گئی۔ بچہ اور ہرنی جنگلی گائے کے ریوڑ سے محبت کرنے لگے اور جنگلی گائے کا ریوڑ بھی ان سے محبت کرنے لگا۔ یہ ریوڑ بھی ہر وقت بچہ اور ہرنی کے ساتھ رہنے لگا اور جس جگہ یہ دونوں رات کو رہتے تھے اس کے قریب ہی یہ ریوڑ بھی رات گزارتا۔ بچہ ہر کام میں ہرنی کی نقل کرنے لگا۔ جیسی آوازیں ہرنی کے منہ سے نکلتی ویسی ہی آوازیں وہ نکالنے کی کوشش کرتا حتیٰ کہ دونوں کی آوازوں میں کسی قسم کا فرق نہیں پایا جاتا تھا۔ اسی طرح یہ بچہ گائے کے اس ریوڑ کی آوازوں کی نقل بھی اتارنے لگا جو اس کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ گائیں اس سے محبت کرتی تھیں۔ اور وہ ان سے محبت کرتا تھا۔ اسی طرح یہ بچہ ان تمام پرندوں اور جانوروں کی نقل اتارنے کی کوشش کرتا جن کی آوازیں وہ دن رات جنگل میں سنتا رہتا تھا۔ خاص طور پر وہ ہرنی کی آوازوں کی زیادہ نقل کرتا تھا۔ مدد کے لئے بلانے کی آواز الگ تھی۔ پیار و محبت کی آواز الگ تھی۔ بھوک اور پیاس کی آواز الگ تھی۔ اسی طرح جنگل کے تمام جانور مختلف کاموں کے لئے مختلف قسم کی آوازیں نکالتے تھے

اب یہ بچہ جانوروں کی آوازیں اور بولیوں سے مانوس ہو چکا تھا۔ اس طرح تمام جانور اور پرندے بھی اس سے مانوس ہو چکے تھے۔ اس کے دل و دماغ میں ان سب جانوروں کی مختلف شکلیں جم گئی تھیں۔ کبھی وہ کسی جانور کے بارے میں سوچتا کبھی کسی پرندے کے بارے میں سوچتا کبھی اس کا دل مور کو دیکھنے کو چاہتا اور کبھی وہ بندر کے بارے میں سوچ کر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتا۔

روشنی

انتخاب : محمد سلیم امام، ابوظہبی

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ رسول اللہؐ کے پاس آپؐ کے حجرے میں حاضر ہوئے۔ دیکھا کہ حضورؐ ایک چمڑے کے تکیے سے (جس میں کھجور کے پتے اور چھال بھری ہوئی تھی) ٹیک لگائے ہوئے ایک کھردری چٹائی پر لیٹے ہیں اور آپؐ کے جسم مبارک پر چٹائی کے نشانات پڑگئے ہیں۔

حضرت عمرؓ نے حجرے میں اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی لیکن تین سوکھے چمڑوں اور تھوڑے سے جو کے سوا اور کچھ سامان نظر نہ آیا۔ یہ دیکھ کر حضرت عمرؓ رو دیے۔

حضورؐ نے انہیں روتا دیکھا تو پوچھا : "عمر! کیا بات ہے؟ کیوں روتے ہو؟"

حضرت عمرؓ نے عرض کیا :

"یا رسول اللہ! کیوں نہ روؤں۔ آپؐ کے بدن پر چٹائی کے نشانات پڑگئے ہیں اور آپؐ کے گھر جو سامان ہے وہ بھی مجھے نظر آرہا ہے ادھر قیصرو کسریٰ ہیں جو عیش و آرام سے ہیں اور دنیا کے مزے لوٹ رہے ہیں جب کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں اور ان سب چیزوں سے بے نیاز ہیں۔"

حضورؐ نے یہ سُن کر فرمایا :

"اے عمرؓ! کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ ہم آخرت لیں اور وہ دنیا؟"

شاعر : رعنا اکبر آبادی

انتخاب : محمد اظہر خان

حمدِ باری تعالیٰ

بھلوں کا بُروں کا سہارا خدا ہے   خدا سب کا ہے سب کو پیارا خدا ہے
ہمارا خدا ہے   ہمارا خدا ہے

زمین جس کی ہے جس کا یہ آسماں ہے   جو ماں باپ سے بھی سوا مہرباں ہے
ہمارا خدا ہے   ہمارا خدا ہے

ہماری ہی خاطر یہ بستی بسائی   ہمارے لئے جس نے دنیا بنائی
ہمارا خدا ہے   ہمارا خدا ہے

مہکتے ہوئے پھول جس نے کھلائے   یہ بہتے ہوئے جس نے دریا بنائے
ہمارا خدا ہے   ہمارا خدا ہے

دعا

نائلہ معین الدین

کوئی بھی دادی اماں کو سیٹ دینے پر تیار نظر نہ آتا تھا۔ لوگ سیٹوں پر پتھر کی مورت بنے اِس طرح سے بے حس بیٹھے تھے جیسے اِن کے جسموں میں دل نام کی کوئی چیز ہی نہ ہو..... اُس بچی کی کہانی دُعا جس کے ساتھ چل رہی تھی ....!!

ہم مزے مزے سے کھڑکی والی سیٹ پر بیٹھے تیزی سے بھاگتے ہوئے نظارے دیکھ رہے تھے۔ گاڑی میں زیادہ رش نہیں تھا۔ ساری سیٹیں پُر تھیں البتہ کچھ مسافر کھڑے تھے۔ ایک اسٹاپ پر بس رُکی تو ایک لکڑی کی طرح سُکڑی سِمٹی دادی اماں گاڑی میں چڑھ آئیں۔ انہوں نے چاروں طرف متجسس نظروں سے دیکھا شائد کوئی سیٹ خالی ہو لیکن سیٹیں تو ساری پُر تھیں۔ وہ ہماری سیٹ سے خاصا دور تھیں۔ ہم نے سوچا۔ کوئی نہ کوئی تو انہیں ضرور سیٹ دے دے گا۔ لیکن لوگ پتھر کی مورت بنے اس طرح بیٹھے ہوئے تھے جیسے ان کے جسموں میں دل نام کی کوئی چیز ہی نہ ہو۔

"ادھر آجایئے اماں جی!" لوگوں کی بے حسی دیکھ کر ہم اٹھ کھڑے ہوئے اور پھر سہارا دے کر اماں جی کو سیٹ پر بٹھا دیا۔ "اللہ تمہاری عمر دراز

کرے------- تمہیں صحت و تندرستی دے تمہیں... مشکلات سے محفوظ رکھے۔" دادی اماں نے ایک ہی سانس میں ڈھیروں دعائیں دے ڈالیں---------اتنی....... ساری......... دعائیں---------خوشی سے ہمارا دل لبریز ہوگیا۔ گاڑی چل پڑی------کچھ ہی دیر بعد ہمارا اسٹاپ آگیا اور ہم امی ابو کے ساتھ گاڑی سے اُتر کر گھر چلے آئے۔

دوسرے دن اسکول پہنچے۔ کلاس میں جیسے ہی داخل ہوئے تو اک دم سے خیال آیا کہ آج پہلے پریڈ میں مس رخسانہ انگلش کی کاپیاں چیک کریں گی۔ ہماری پٹائی ہونا لازمی تھی کیوں کہ ہماری کاپی ماہین لے گئی تھی اور وہ آج اسکول نہیں آئی تھی------- مس نے کاپیاں چیک کرنا شروع کیں لیکن اس سے پہلے انہوں نے کہا۔ "جن لڑکیوں نے کام نہیں کیا یا جن کے پاس یہ بہانہ ہے کہ ہم انگلش کی کاپی گھر بھول آئے ہیں وہ باہر آجائیں۔" کام چور لڑکیاں ایک قطار میں کھڑی ہوگئیں۔ ہم بھی ان میں شامل تھے۔ ہمیں کام چور لڑکیوں کی صف میں کھڑا دیکھ کر مس رخسانہ کچھ ٹھٹھکیں پھر ہمارے قریب آکر کہا۔

"آپ بیٹھ جائیں۔ آپ کی کاپی میں چیک کرچکی ہوں۔ آپ کا کام مکمل ہے۔"

"لل-----لل------لیکن مس ہماری کاپی تو ماہین کے پاس ہے اور ماہین تو آج آئی.......... نہیں........ ہے۔"

"پھر-------پھر------آپ؟"

ہماری یہ بات سن کر مس رخسانہ مُسکرائیں اور بولیں۔

"بھئی ماہین کی امی ہماری بچپن کی دوست ہیں۔ کل اتفاق سے ہماری ان سے سرِراہ ملاقات ہوگئی۔ وہ ہمیں اپنے گھر لے گئیں-------وہاں ماہین ملی تو پتا چلا کہ وہ ان کی بیٹی ہے۔ خیر ہم ماہین سے باتیں کررہے تھے۔ وہ اس وقت انگلش کا کام کررہی تھی۔ ہم نے پوچھا تو کہنے لگی مس یہ رابعہ کی کاپی ہے۔ میں اس میں سے دیکھ کر لکھ رہی ہوں۔ ہم نے آپ کی کاپی ایسے ہی اٹھا کر دیکھنا شروع کی تو اس میں سارا کام مکمل تھا۔ ہم نے وہیں آپ کی کاپی چیک کی اور دستخط کردیئے۔ شاباش! آپ نے بہت صاف ستھرا کام کیا ہے۔"

مس سے شاباشی لے کر ہم اپنی سیٹ پر آبیٹھے۔ سب کے سامنے پٹنے کی بے عزتی سے جو بچ گئے تھے------اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے ہمیں ایک دم سے بس والی دادی اماں یاد آگئیں جنہوں نے کہا تھا۔ "اللہ تمہیں ہر مشکل سے محفوظ رکھے۔" انہی کی دعا نے ہمیں پٹنے سے بچالیا تھا------!!

پرندے، پرواز اور ہجرت

نوید اختر

ہمالیہ کی چوٹیاں ہوں، گھنے اور تاریک جنگل ہوں، پُرشور شہر ہوں یا وسیع ریگستان، پرندے ہرجگہ پائے جاتے ہیں۔ جانداروں میں آبادی کے لحاظ سے پرندے تیسرے نمبر پر ہیں، اوّل نمبر مچھلیوں کا ہے۔ پرندوں کا ارتقا رینگنے والے جانوروں سے ہوا۔

جسم کی ساخت:۔ پرندوں کی خصوصیات بال و پر ہیں۔ بعض ایسے پرندے بھی ہیں جن کے پر نہیں ہوتے مثلاً پنگوئن اور بعض ایسے ہیں جن کے پر ہوتے ہیں مگر اُڑ نہیں سکتے۔ مثلاً نیوزی لینڈ کا کیوی اور افریقہ کا شُترمرغ۔

پرواز:۔ پرندے کی ہڈیاں کھوکھلی ہوتی ہیں جن سے ان کو اُڑنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ اس کے علاوہ مختلف قسم کی پرواز کے لئے مختلف پرندوں کے پر مختلف ہوتے ہیں۔ جیسے طویل پرواز کے لئے مرغابی کے نوکیلے پر۔

چھوٹے پرندے مثلاً چڑیا وغیرہ اپنے گول پر ایک شاخ سے دوسری شاخ پر اُترنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

دریائی بگلے کے پر بڑے اور چوڑے ہوتے ہیں جنہیں آہستہ آہستہ وہ حرکت میں رکھتے ہیں۔

اس کے علاوہ پرندے کی ایک خصوصیت اسکی چونچ ہے۔ پرندہ جیسی خوراک کھانا پسند کرتا ہے ویسی اس کی چونچ ہوتی ہے۔

ہجرت:۔ زمانۂ قدیم سے پرندے خزاں میں اپنا وطن چھوڑ دیتے اور میں دوبارہ واپس آجاتے ہیں اس کی مثال وسطی امریکہ کی ۱۸۰۰ میل کی پٹی میں اربوں پرندے ایک دوسرے پر گرتے نظر آتے ہیں۔ وہ سب پرندے نقلِ مکانی کر رہے ہوتے ہیں۔ ہجرت کے فوراً بعد پرندوں کو بے پناہ غذا کی ضرورت ہوتی ہے۔

ہجرت کا مشاہدہ:۔ ہجرت کے مشاہدے کے لئے آجکل پرندوں کی گردن یا پنجے میں مخصوص چھلا ڈال دیا جاتا ہے۔ جس سے اس کی پہچان رہتی ہے۔

روس امریکہ اور یورپ میں یہ طریقہ رائج ہے۔ ان ممالک میں تقریباً ۲۰۰۰۰۰ پرندوں کو چھلا پہنایا جاتا ہے۔ ہر سال ان کے ہجرت والے مقام کا پتہ اسی طریقے سے چلایا جاتا ہے۔

آپ بھی لکھیں

کوئی یادگار واقعہ جو زندگی میں کبھی آپ کے ساتھ پیش آیا ہو، کوئی نیکی جو آپ نے کسی کے ساتھ کی ہو اور ان میں سے کوئی ایسا لمحہ جو آپ کو بہت اچھا لگا ہو۔ اگرچہ آپ ادیب نہیں مگر اپنی زندگی کے یادگار واقعات میں سے کوئی بھی ایسا اچھا لمحہ اپنے الفاظ میں ہمیں لکھ بھیجیں۔ واقعات کی نوک پلک ہم خود درست کرلیں گے۔ ہر ماہ شائع ہونے والے سب سے بہترین واقعہ پر انعام دیا جائے گا۔ اپنی نیکیاں اور واقعات اس پتے پر ارسال کیجیے۔

مجھے اچھا لگا

قلم دوست
ماھنامہ آنکھ مچولی
۱۔ پی آئی بی کالونی کراچی
پوسٹ کوڈ ۷۴۸۰۰

بلی جو پلاسٹک کی تھیلی بن گئی

سید محمد اسامہ

جمعرات کی رات تھی میں سیڑھیاں پھلانگتا کالی بلی کے پیچھے بھاگا چھت پر پہنچا تو دیکھا بلی پلاسٹک کی تھیلی بن گئی تھی

میرے سر کے بالوں میں سرسراہٹ ہو رہی تھی۔ کوئی کمرے میں موجود تھا۔ میری آنکھ کھل گئی۔ سردیوں کے دن --- رات کے دو بجے کا وقت لحاف سے نکلنے کو دل نہ چاہے لیکن مجھے اُٹھنا پڑا کچھ خوف سے اور کچھ اس تجسس سے کہ دیکھیں تو کون ہے جو میرے سر کے بالوں میں ہاتھ پھیر رہا ہے، ڈرتے ڈرتے زیرو پاور کی دم توڑتی ہوئی روشنی میں سوتی جاگتی آنکھوں اور دھڑکتے دل کے ساتھ میں نے دیکھا ایک سیاہ بھجنگ بلی میرے سرہانے بیٹھی میرے بال چاٹ رہی ہے۔ اس کی آنکھیں مدھم روشنی میں بلبوں کی طرح چمک رہی تھی۔

"ہش --- ہش ----!!" میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بھگایا اور وہ کمرے سے

بھاگ گئی ـ ـ ـ کم بخت نے ڈرا ہی دیا۔ میں تو سمجھ رہا تھا کوئی ڈائن ہے جو میرے سر کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی ہے۔ مجھے اپنی سوچ پر ہنسی آگئی۔ پھر سردی کا احساس ہوا تو میں لحاف میں گھس گیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ نیند اس طرح اچانک اُٹھنے پر ٹوٹ گئی تھی اس لئے آنکھوں میں سما نہیں رہی تھی۔ میں نے بستر پر کروٹ بدلی اور پھر اچانک ہی احساس ہوا کہ کوئی کمرے میں دوبارہ داخل ہوا ہے۔ گردن اُٹھا کر دیکھا۔ وہی کالی بلی تھی، میرے پلنگ کے پاس کھڑی اپنی چمکتی آنکھوں سے گھور رہی تھی۔

"یہ کم بخت پھر آگئی۔" مجھے نہ جانے کیوں کچھ خوف سا محسوس ہوا۔ "ہش ـ ـ ـ ہش ـ ـ ـ!!" میں نے اس کو بھگایا اور وہ بھاگ گئی۔ "آج جمعرات ہے ـ ـ ـ کالی جمعرات ـ ـ ـ فقیر کو کچھ دیتا جا ـ ـ ـ ورنہ ـ ـ ـ!!" مجھے بستر پر لیٹے لیٹے اس ملنگ کے جملے یاد آگئے جو اسکول سے گھر واپس آتے ہوئے اس نے بھیک مانگنے کے دوران مجھ سے کہے تھے اور میں نے اسے جھڑک دیا تھا کہ شرم نہیں آتی اتنے ہٹے کٹے ہو کر بھیک مانگتے ہو اور اس پر وہ خاصا چراغ پا ہوا تھا۔ اس کی سرخ سرخ پھٹی پھٹی آنکھیں ـ ـ ـ بالکل اس کالی بھجنگ بلی کی طرح۔ مجھے اک دم سے ایک ڈراؤنی فلم یاد آگئی جس میں ایک شیطانی روح جانوروں کا روپ دھار لیتی۔۔۔۔اور پھر انسانوں کا خون پیتی تھی۔ "کیا وہ ملنگ بھی کوئی شیطانی روح ـ ـ ـ؟" میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی پھر ایسی اوٹ پٹانگ باتیں سوچتے ہوئے نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔ شاید میں تھوڑی ہی دیر سویا ہوں گا اچانک آنکھ کھُل گئی کوئی میرے بالوں کو چاٹ رہا تھا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ دیکھا وہی کالی بلی تھی۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ سردی ہونے کے باوجود پسینہ میرے چہرے سے بہہ رہا تھا۔ مجھے اُٹھتا دیکھ کر کالی بھجنگ بلی نے پلنگ سے نیچے چھلانگ ماری اور کھلے دروازے کی چوکھٹ پر کھڑی ہو کر اپنی لال لال آنکھوں سے گھورنے لگی۔

"ہش ـ ـ ـ ہش ـ ـ ـ!!" میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے بھگایا لیکن اس بار وہ بھاگی نہیں بلکہ دروازے پر ہی کھڑی رہی۔ مجھے ڈر تو لگ رہا تھا لیکن اُٹھ بیٹھا۔ چپلیں پاؤں میں ڈالیں اور بلی کے پیچھے بھاگا۔ بلی چلتی ہوئی صحن میں پہنچ گئی میں جب صحن تک پہنچا تو وہ وہاں نہیں تھی بلکہ زینے کے اوپر کھڑی تھی۔

"ہش ـ ـ ـ ہش ـ ـ ـ!!" میں نے اسے ڈرایا لیکن اس پر کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے زینے پر قدم رکھا۔ بلی اپنی جگہ کھڑی رہی۔ پھر جب میں نے دو تین زینے طے کئے تو وہ چھت پر بھاگی۔ میں زینے طے کر کے جیسے ہی چھت پر پہنچا تو کیا دیکھتا کہ بلی پلاسٹک کی

تھیلی بن گئی ہے۔ یہ حیرت ناک منظر دیکھ کر مجھے یوں لگا جیسے میرے جسم میں جان ہی نہ رہی ہو۔ چھت پر چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ چندا ماموں میرے سر کے اوپر تھے اور نیچے چھت پر میں پلاسٹک کی تھیلی کو خوف و دہشت کے عالم میں دیکھ رہا تھا جو کچھ دیر پہلے بلی تھی اور اب پلاسٹک کی تھیلی کا روپ دھار لیا تھا ---- اک دم سے چاند کی روشنی میری نگاہوں کے سامنے سے غائب ہوگئی۔ چاروں طرف اندھیرا سا چھا گیا پھر ایک زوردار دھماکہ ہوا اور میں دھڑام سے چھت کے فرش پر گر پڑا۔

جب مجھے ہوش آیا تو صبح کا وقت تھا اور میرے بستر کے قریب گھر کے تمام افراد جمع تھے۔ "کیا ہوا تھا؟" "چھت پر کیوں گئے تھے؟" "کیا بچھل پیری بلا نظر آگئی تھی جو بے ہوش ہوگئے تھے؟" گھر والوں کے پے در پے سوالات کی بوچھاڑ تھی جو مجھ پر سوار ہو رہی تھی پھر میں نے مختصر الفاظ میں سارا واقعہ سنا ڈالا۔

میری بات کے ختم ہوتے ہی ایک زوردار قہقہہ مجھے سنائی دیا۔ آپا اور بڑے بھیا بری طرح ہنس رہے تھے۔ "ارے ڈرپوک! وہ کالی بلی تو برابر والی خالہ کی ہے۔" بڑے بھیا نے میرے سر پر ہلکی سی چپت لگائی۔ "اور پتا ہے وہ تمہارے سر کے بال کیوں چاٹ رہی تھی۔ یاد کرو کل تم نے سر میں جڑی بوٹی والا تیل لگایا تھا۔ اس کی خوشبو کی وجہ سے بلی بار بار آرہی تھی۔ کئی بار میرے کمرے میں بھی آئی کیوں کہ کل رات میں نے بھی وہی جڑی بوٹی والا تیل لگایا تھا۔" آپا نے بتایا۔

"لیکن وہ پلاسٹک کی تھیلی؟" میرے لہجے میں اُلجھن تھی۔

کل بچے ماموں کے گھر سے اس میں جامنیں لائے تھے اور چھت پر بیٹھ کر کھا رہے تھے۔ جامنیں کھانے کے بعد تھیلی انہوں نے وہیں پھینک دی تھی۔" اس بار امی نے جواب دیا۔

بلی تو چھت سے دوسرے گھر میں کود گئی ہوگی اور تم پلاسٹک کی تھیلی چھت پر دیکھ کر اسے بلی کا عکس سمجھ بیٹھ ہوگے۔" بھیا نے ہمارے بال بگاڑ دیئے۔ اسی وقت میاؤں میاؤں کی آوازیں سنائی دیں۔ "امی امی! کالی بلی آگئی جادوگرنی آگئی۔" ہمارے منے بھائی کامی نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان بھاگتے ہوئے آکر اطلاع دی۔ سب لوگ صحن میں پہنچے اور پھر وہاں پہنچتے ہی صحن قہقہوں سے گونج اٹھا۔ پلاسٹک کی تھیلی بن جانے والی وہی کالی بلی صحن میں رکھی جڑی بوٹی والے تیل کی بوتل کے گرد چکر لگا رہی تھی اور بار بار بوتل کو سونگھ کر میاؤں میاؤں کا شور مچا رہی تھی ---!!

مستقبل کا آئینہ

فاطمہ قریشی

بہت سے لوگ خوابوں پر یقین نہیں رکھتے لیکن کچھ خواب آئندہ پیش آنے والے واقعات کی نشاندھی کررہے ہوتے ہیں... ایک ایسا ہی خواب فاطمہ قریشی سنا رہی ہیں۔

رابعہ اپنا ضروری کام نمٹانے کے بعد کرسی پر آرام کرنے کے لئے بیٹھ گئی تو اس کی نظر پاس پڑی ہوئی ایک کتاب قیامت کی "نشانیاں" پر پڑی اس نے اسے اٹھایا اور دیکھنے لگی، اس کے شروع کے صفحے پر لکھا تھا کہ :

اگر دس نشانیاں اس دنیا میں موجود ہوں تو قیامت آئے گی اس کے شروع میں "دھواں" لکھا تھا "دھواں" سے کیا مطلب ہوگا وہ سوچنے لگی اچانک اس کے ذہن میں ایک دھماکہ ہوا اور اس کے ذہن میں اس وقت یہی خیال آیا کہ ہو بہو یہ پھیلی پولوشن ہے جس کی وجہ سے ساری دنیا خطرے کی لپیٹ میں ہے یہ سوچ کر وہ جلدی جلدی اور آگے پڑھنے لگی، اس کے بعد لکھا تھا جب قوم سود لے گی، "سود" اس کے لہجے میں طنز بھر گیا کیا قرضوں پر سود نہیں ہوتا، یہ بینک والے سود نہیں دیتے ہیں کیا اس کے بعد لکھا تھا "آخری نبی حضرت محمدؐ کے بعد ان کے اُمت ہی کے لوگ نبی ہونے دعویٰ کریں گے۔ وہ سوچنے لگی کہ یہ قادیان قوم جو ہے جنہوں نے نبیؐ کے بعد اور پیغمبر بنا لئے ..... ہیں یہ بھی تو مسلمان ہی تھے۔ آگے لکھا تھا "دجال کی حکومت ہوگی" "دجال" ہاں ابھی اس کی حکومت نہیں آئی شکر

ہے اللہ ابھی قیامت نہیں آئے گی اللہ نے ہمیں اتنی مہلت تو دی کہ اپنے غلطیوں کی معافی تو مانگ سکیں رابعہ نے سکھ کا سانس لیا۔ اس کے بعد وہ سونے کے لئے اپنے ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔ ٹی وی میں خبرنامہ آرہا تھا خبر میں ایک اہم خبر یہ تھی کہ امریکہ کا وزیراعظم منتخب ہوچکا ہے اور اس کا نام "Jondejal" تھا اور اس نے ۸۸ ٪ ووٹ حاصل کئے تھے۔ چند روز بعد امریکہ میں مخالفت کی وجہ سے صدر نے استعفیٰ دے دیا اور اس کی جگہ نئے وزیراعظم نے صدر کی نشست سنبھال لی کیونکہ امریکہ کے لوگ اسے صدر بنانا چاہتے تھے پھر ایک روز بعد اخبار میں شہہ سرخی لگی.....کہ امریکہ میں ایک شخص اپنے آپ کو اللہ کا پیغمبر ثابت کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں پہلا پیغمبر تھا۔ جس کی وجہ سے تمام مسلمان اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا کہ اسے گرفتار کرلو کیونکہ یہ ہمارے مذہب کے خلاف غلط باتیں کرتا ہے ورنہ ہم خود کوئی قدم اٹھالیں گے اس شخص نے یہ سنا تو کہنے لگا کہ میں تو خود مسلمان ہونے والا تھا اور وہ مسلمان ہوگیا لوگ کہنے لگے کہ بیچارہ ڈر کی وجہ سے مسلمان ہوگیا ہے رابعہ کو اس ساری صورت حال کا علم تھا، کیونکہ وہ روزانہ اخبار پڑھتی تھی، ایک دفعہ جب سب چائے پی رہے تھے تو رابعہ نے اپنے ابو سے کہا کہ اس روز جو اخبار میں ایک شخص کے بارے میں گیا تھا کہ وہ کہتا تھا کہ وہ پہلے پیغمبر تھا اس کا نام کیا ہے اس کا نام عی مسی ہے۔ لیکن یہ تو ہمارے پیغمبر کا نام تھا "ارے تم کونسے جہاں میں رہتی ہو کرسچن لوگ تو ہر دس ناموں میں ایک نام عیسیٰ، یسوع، مسیح رکھتے ہیں یہ سب نام ان کے ہاں بہت عظیم ہوتے ہیں۔" اچانک رابعہ کو کچھ یاد آیا اور اس نے وہی کتاب قیامت کی نشانیاں نکالی، اس میں پانچ نمبر پر لکھا تھا کہ "حضرت عیسیٰ علیہ السلام" دجال کی حکومت میں آئیں گے اور اسلام قبول کریں گے" اوہ اگر یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں تو پھر دجال کون ہے دجال امریکہ کے صدر کا نام جون دجال ہے کیا یہ وہی تو نہیں "ابھی رابعہ اتنا ہی سوچ پائی تھی کہ امی کی آواز سن کر اس کی آنکھ کھل گئی "رابعہ اٹھو نماز نہیں پڑھنا؟" وہ اٹھی نماز پڑھنے کے بعد یہ خواب اسے یاد نہیں رہا کالج جاتے ہوئے اخبار پر نظر کی تو اس میں ایک خبر یہ بھی تھی کہ امریکہ میں مخالف پارٹی حکومت کے خلاف زور پکڑ رہی ہے حکومت اس کو گرفتار کررہی ہے پارٹی صدر کا نام جون دجال ہے" کیا۔۔۔۔؟" رابعہ کو اپنا خواب یاد آیا "تو کیا میرا خواب ؟؟؟"

طوطا، شہزادہ اور لڑکی

شاہین برکات

طوطا اُڑتا ہوا گیا اور لڑکی کے ہاتھ پر جا بیٹھا پھر انسانی آواز میں کہا۔ "ارے اچھی لڑکی! یوں اُداس کیوں بیٹھی ہو.. اپنا درد مجھے بتاؤ شاید میں تمہاری کچھ مدد کرسکوں۔

شاہی محل میں شہزادہ کی پچیسویں سالگرہ کے سلسلے میں ہونے والے جشن جو کہ اب سے ٹھیک تین دن بعد تھا' کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔ اس جشن میں ساری رعایا کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ بادشاہ اس خوشی کے موقع پر اپنی تمام رعایا کو شریک کرنا چاہتا تھا۔ شہزادہ چونکہ غیر شادی شدہ تھا اس لئے رعایا میں یہ خیال پایا جاتا تھا کہ سالگرہ کے جشن میں اگر شہزادہ کو کوئی لڑکی پسند آگئی تو وہ اس کو اپنی دلہن بنالے گا۔ کیونکہ بادشاہ نے بھی ایک ایسی ہی تقریب میں ملکہ کو پسند کرکے شادی کی تھی۔ شہزادہ بادشاہ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ نہایت خوبصورت اور وجیہہ۔ بادشاہ شہزادہ کو بے حد چاہتا تھا اس کی ہر خواہش پوری کرتا تھا۔ شہزادہ اس وقت محل کے باغ میں چہل قدمی کررہا تھا کہ اچانک اس کی نظر درخت کے نیچے ایک زخمی بُلبل پر پڑی جس کے پر زخمی تھے اور ان سے خون رس رہا تھا۔ شہزادہ رحمدل تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر بُلبل کو ہاتھ میں اُٹھایا اور ابھی اس

کی مرہم پٹی کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک بلبل اس کے ہاتھ سے نکل گئی اور ایک پری کے روپ میں سامنے آگئی شہزادہ ابھی یہ سب کچھ دیکھ کر حیران ہی ہو رہا تھا کہ اچانک پری بولی "اے رحمدل شہزادے! میں زخمی بلبل نہیں بلکہ ایک پری ہوں تمہارے محل کے اوپر سے گزر رہی تھی کہ اچانک میری نظر تم پر پڑی تو میں نے تمہارا امتحان لینے کے لئے کہ اس ملک کا شہزادہ رحمدل ہے کہ نہیں ایک زخمی بلبل کا روپ دھار لیا۔ تم امتحان میں پورے اترے۔ اس لئے میں خوش ہو کر انعام کے طور پر تمہاری ایک خواہش پوری کرنا چاہتی ہوں۔ اپنی کوئی ایک خواہش بتاؤ" شہزادہ بولا "اچھی پری تمہارا بہت بہت شکریہ میری خواہش یہ ہے کہ جس

طرح تم پری سے بلبل بن گئیں اس طرح میں بھی جب چاہوں کسی بھی جانور یا پرندے کا روپ دھار لوں چاہے مختصر عرصہ کے لئے سہی۔" پری بولی "اچھا ٹھیک ہے۔ تم تین دن تک کسی بھی جانور یا پرندے کا روپ دھار سکتے ہو جب بھی تم آنکھ بند کر کے کسی بھی جانور یا پرندے کا تصور کرو گے کہ میں یہ بن جاؤں تم وہی بن جاؤ گے۔ اور جب اپنی اصلی حالت میں واپس آنا چاہو تو پھر آنکھیں بند کر کے تصور کرنا کہ میں اپنی اصلی حالت میں واپس آجاؤں تو تم دوبارہ اصلی حالت میں واپس آجاؤ گے۔ ایسا صرف تین دن تک ممکن ہو سکے گا۔" یہ کہہ کر پری غائب ہو گئی۔ پری کے جانے کی بعد شہزادہ نے آنکھیں بند کر کے طوطا بن جانے کا تصور کیا دوسرے ہی لمحہ وہ طوطا بن گیا۔ اب تو شہزادہ کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ وہ محل ہی کے باغ میں تھوڑی دیر تک اِدھر اُدھر اُڑتا رہا۔ پھر اس نے محل سے باہر کی اُڑان بھری اور محل سے تھوڑے فاصلہ پر ایک خوبصورت مکان کی دیوار پر بیٹھ گیا۔ اس مکان میں ایک خوبصورت باغ تھا۔ جس میں قسم قسم کے پھلوں اور پھولوں کے درخت تھے اور باغ کے کونے میں ایک کنواں تھا۔ جس کے پاس ایک نہایت حسین و جمیل لڑکی اُداس بیٹھی تھی۔ شہزادہ کی نظر جو اس حسین و جمیل لڑکی پر پڑی تو وہ اس کے بے تحاشہ حسن

میں کھو سا گیا اور دل ہی دل میں اس کو اپنی دلہن بنانے کا فیصلہ کرلیا لیکن اس کے خوبصورت چہرے پر پھیلی اُداسی دیکھ کر شہزادہ بھی اُداس ہو گیا اور اس کی اُداسی کی وجہ جاننے کے لئے بے چین ہو گیا۔ شہزادہ جو کہ اس وقت ایک طوطے کے روپ میں تھا، اُڑتا ہوا گیا اور اس لڑکی کے ہاتھ پر جا بیٹھا اور انسانی آواز میں بولا۔ "اے اچھی لڑکی تم یوں کیوں اُداس بیٹھی ہو اپنا درد مجھے بتاؤ شاید میں تمہاری کچھ مدد کرسکوں۔" طوطے کی یہ بات سن کر لڑکی بولی "میری درد بھری داستان سن کر تم کیا کروگے تم تو خود ایک نازک سے طوطے ہو بھلا تم میری کیا مدد کرسکتے ہو۔" یہ سن کر طوطا بولا "کسی چیز کو کمزور نہیں سمجھنا چاہئے جب ایک چیونٹی ھاتھی کی جان لے سکتی ہے تو پھر میں تو ایک طوطا ہوں۔" یہ سن کر لڑکی کے خوبصورت ہونٹوں پر غمگین مسکراہٹ پھیل گئی اور اس کی خوبصورت جھیل سی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ پھر وہ اداس سی آواز میں بولی "میرا نام چندا ہے۔ میں اپنی سوتیلی ماں اور بہن کے ساتھ رہتی ہوں۔ وہ دونوں مجھ پر بہت زیادہ ظلم کرتی ہیں گھر کا سارا کام کرواتی ہیں میرا باپ ایک مالدار سوداگر تھا یہ دونوں اس کی دولت پر عیش کر رہی ہیں اور میں ایک نوکر سے بھی بدتر زندگی گزار رہی ہوں تین دن بعد شاہی محل میں شہزادہ کی سالگرہ کا جشن ہے۔ وہ دونوں تو شرکت کرنے کی تیاریوں میں لگی ہوئی ہیں اور میں یہاں اپنی بدقسمتی پر آنسو بہا رہی ہوں اس جشن میں بھی میرا شرکت کرنے کا کوئی امکان نہیں اور آج میری سوتیلی ماں مجھ سے گھر کے کام کے علاوہ کہہ کر گئی ہے کہ اس کی انگوٹھی کنویں میں گرگئی ہے اس کے آنے تک اسے نکال کر رکھوں۔ اس نے جان بوجھ کر یہ انگوٹھی کنویں میں گرائی ہے تاکہ وہ مجھ پر مزید ظلم کرسکے۔ بھلا بتاؤ میں اس کام کو کیسے کرسکتی ہوں۔ یہ تو ناممکن ہے" شہزادہ جو کہ اس وقت طوطے کے روپ میں تھا۔ چندا کی دکھ بھری داستان سن کر اسے بہت افسوس ہوا۔ شہزادے نے لڑکی سے کہا "مجھے تمہاری دکھ بھری داستان سن کر بہت افسوس ہوا۔ آج سے تم مجھے اپنا دوست سمجھو اور رہی کنویں سے انگوٹھی نکالنے والی بات تو تم تھوری دیر تک کے لئے آنکھیں بند کرو جب میں کہو تو کھولنا اور دوسرے آنکھیں کھولنے کے بعد تم کوئی سوال نہیں کروگی۔" لڑکی نے ایسا ہی کیا۔ چندا کی آنکھیں بند کرتے ہی شہزادے نے مچھلی کا روپ دھارا اور تھوڑی ہی دیر میں کنویں سے انگوٹھی نکال لایا اور دوبارہ طوطے کا روپ دھار کر لڑکی سے آنکھیں کھولنے کو کہا۔ طوطے کی چونچ میں انگوٹھی دیکھ کر وہ لڑکی

بے انتہا خوش ہوئی اس کے گلابی گال خوشی سے دمکنے لگے۔ انگوٹھی چندا کو تھما کر شہزادہ دوسرے دن اسی وقت آنے کا کہکر واپس اپنے محل میں آگیا دوسرے دن جب شہزادہ طوطے کے روپ میں دوبارہ اسی وقت آیا تو لڑکی کو ایک درخت کے نیچے اداس بیٹھا پایا پوچھنے پر معلوم ہوا کہ آج اس کی ماں اس سے درخت کے سارے آم توڑ کر رکھنے کو کہہ گئی ہے اور وہ لڑکی یہی سوچ کر پریشان تھی کہ اس کو تو درخت پر چڑھنا بھی نہیں آتا وہ یہ کام کیونکر کر سکے گی۔ اس کی پریشانی کا سبب جان کر شہزادے نے کہا "گھبراؤ مت تمہارا یہ کام بھی تھوڑی دیر میں ہو جائے گا۔" پھر اس نے لڑکی کو آنکھیں بند کرنے کو کہا اس کے آنکھیں بند کرتے ہی شہزادہ نے بندر کا روپ دھارا۔ اور تھوڑی ہی دیر میں درخت کے سارے آم توڑ کر نیچے ڈھیر لگا دیئے اور دوبارہ طوطے کا روپ میں آکر لڑکی سے آنکھیں کھولنے کو کہا۔ لڑکی نے جو درخت کے آموں کا ڈھیر دیکھا تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی اور وہ تشکّر بھری نگاہوں سے طوطے کی طرف دیکھنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد شہزادے نے لڑکی سے رخصت چاہی اور واپس اپنے محل آگیا۔ تیسرے دن شہزادہ پھر اسی وقت اس لڑکی کے پاس طوطے کے بھیس میں جا پہنچا۔ آج وہ لڑکی بڑی خوش تھی اور کھانے پینے کی اچھی اچھی چیزیں لے کر اسی کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ شہزادہ جو کہ اس وقت طوطے کے بھیس میں تھا لڑکی کے ہاتھ پر جا بیٹھا وہ لڑکی پیار سے شہزادہ کا سر سہلاتے ہوئے بولی "اچھے طوطے تمہاری مدد سے جو میں نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا تو میری ماں اور بہن ذرا ڈر گئی ہیں اس لئے انہوں نے آج مجھے ایسا کوئی کام نہیں بتایا" پھر وہ اپنے ہاتھ سے شہزادہ کو مزے مزے کی چیزیں کھلانے لگی۔ شہزادہ بھی مزے لے لے کر کھانے لگا۔ اس لڑکی کے خواب میں بھی نہ تھا کہ وہ طوطے کے بھیس میں ایک شہزادے سے باتیں کر رہی ہے۔ پھر چندا نے شہزادے سے جو کہ اس وقت طوطے کے بھیس میں تھا مخاطب کیا' "اے اچھے طوطے اگر میں تمہارے کسی کام آسکی تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔" شہزادہ جو کہ اس بات کے انتظار میں تھا فوراً" بولا "اگر ایسی بات ہے تو وعدہ کرو کہ تم میری یہ بات ضرور مانو گی کہ کل جو شہزادہ کی سالگرہ کا جشن ہے اس میں ضرور شرکت کرو گی۔" چندا طوطے کی اس بات سے انکار نہ کر سکی اور وعدہ کر بیٹھی۔

دوسرے دن جب اس کی ماں اور بہن تیار ہو کر جشن میں شرکت کے لئے روانہ ہو گئی تو ان کے جانے کے بعد وہ بھی تیار ہو گئی۔ اور محل کی

طرف روانہ ہوگئی ۔ چندا نے جیسے محل کے دروازے پر قدم رکھا دروازہ خود بخود کھلتا چلا گیا۔ شہزادہ اپنے بے شمار ملازموں کے ساتھ اس کا استقبال کرنے آیا اور اس کے کان میں جھک کر اسے ساری بات بتادی کہ وہ دراصل اس ملک کا شہزادہ ہے جو پری کے انعام کی بدولت طوطے کا روپ بدل کر اس کے گھر آیا تھا۔ پھر شہزادے نے لڑکی سے شادی کی درخواست کی لڑکی نے جو دیکھا کہ طوطا تو دراصل شہزادہ ہے تو اتنے خوبصورت شہزادے کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئی۔ اس نے شرما کر سر جھکالیا اور رضا مندی دیدی۔ شہزادہ اپنی ہونے والی شہزادی کو محل میں لے گیا۔ پھر بادشاہ نے اعلان کروایا کہ شہزادے نے اپنے لئے دلہن کا انتخاب کرلیا ہے۔ آج شہزادے کی سالگرہ کے جشن کے ساتھ ساتھ اس کی شادی کا بھی جشن ہے اور یہ جشن ایک ہفتہ تک مزید جاری رہے گا اور یوں دونوں کی بڑی دھوم دھام سے شادی ہوگئی۔

آٹوگراف

☆ اصل دولت مندی دل کی دولت مندی ہے۔

☆ زمانہ کتابوں سے بہتر معلم ہے۔

☆ جب تک آدمی بات نہ کرے اس کی خوبیاں اور خامیاں چھپی رہتی ہیں۔

☆ زبان کی لغزش قدموں کی لغزش سے زیادہ خطرناک ہے۔

☆ کسی دوسرے کے گرنے پر خوش مت ہو۔ کیا معلوم کل تیرے ساتھ کیا ہو۔

☆ کفر کے بعد سب سے بڑا گناہ دل آزاری ہے۔

مرسلہ. بالاچ بلوچ، پسنی

○ شہرت اور ناموری کی خواہش معمولی ذہن رکھنے والوں کی کھلی کمزوری اور بڑے ذہن رکھنے والوں کی پوشیدہ کمزوری ہے۔

○ جس طرح بڑی بڑی صداقتیں نہایت سادہ ہوتی ہیں اسی طرح بڑے بڑے آدمی بھی نہایت سادہ ہوتے ہیں۔

○ ...... اچھی بات جو بھی کہے غور سے سنو۔

○ ...... وہ آدمی کہلانے کا مستحق نہیں جو دوسروں کے غم سے بے نیاز ہو۔

○ ...... بڑا احمق وہ ہے جو دوسروں کو برا سمجھے اور خود ان پر جما ہوا ہو۔

مرسلہ ...... گہرام حیات تربت

مچھر

محمد رضوان عبدالعزیز

مچھروں کے معاملے میں ہم خود کفیل ہو گئے ہیں... اِن کی پیداوار بڑھانے میں ہمارے مُلک کے ایک ادارے کا بھی بڑا ہاتھ ہے...!!

مچھر انسان کا خون چوستا ہے۔ دوسرے معنیٰ ہیں مچھر ہم لوگوں کو کھجانے کی مشق کراتا ہے مچھر کے دانت نہیں ہوتے اس لئے آپ نے کسی مچھر کو دوسرے مچھر سے یہ کہتے نہیں سنا ہوگا کہ میں تمہارے دانت توڑ دوں گا۔

مچھر کے دو پر اور چار ٹانگیں ہوتی ہیں۔

مچھر کو غور سے دیکھیں اگر وہ خون چوستا ہے۔ تو نر ہے اور اگر چوستی ہے تو مادہ ہے۔

مچھروں کے معاملے میں ہم خود کفیل ہوگئے ہیں، ان کی پیداوار بڑھانے میں ہمارے ایک ادارے کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہے۔

مچھر پکڑنے یا مارنے والے کو مچھیرا کہا جاتا ہے۔ جب آج کل کی درسی کتابوں میں بچوں کو گمراہ کرنے کے لئے مچھلیاں پکڑنے والے کو مچھیرا پڑھایا جاتا ہے۔ مچھر ہمیں اس لئے کاٹتا ہے کہ ہمارے خون میں اس کی غذا ہے۔ لیکن آج کل مچھر بھی دھوکا کھا جاتا ہے۔ کیونکہ آدمی کا خون دراصل سفید ہوچکا ہے۔

مچھر اس وقت تک ختم نہیں ہوسکتے جب تک کہ متعلقہ ادارے نہ چاہیں لیکن اگر آپ خود بہت سے مچھر مارنا چاہتے ہیں تو اس کے دو طریقے ہیں۔

۱۔ دو پتھر لیں۔ ایک پتھر پر مچھر کو رکھ لیں اور دوسرے پتھر سے اسے ماریں۔

۲۔ مچھر کو اپنے ہاتھ پر رکھ کر اس کے پیٹ میں گدگدی کریں اور جیسے ہی وہ ہنسنے کے لئے منہ کھولے تو اس کے منہ میں مچھر مارنے والی دوا ڈال دیں۔ لیجئے خس کم جہاں پاک!!

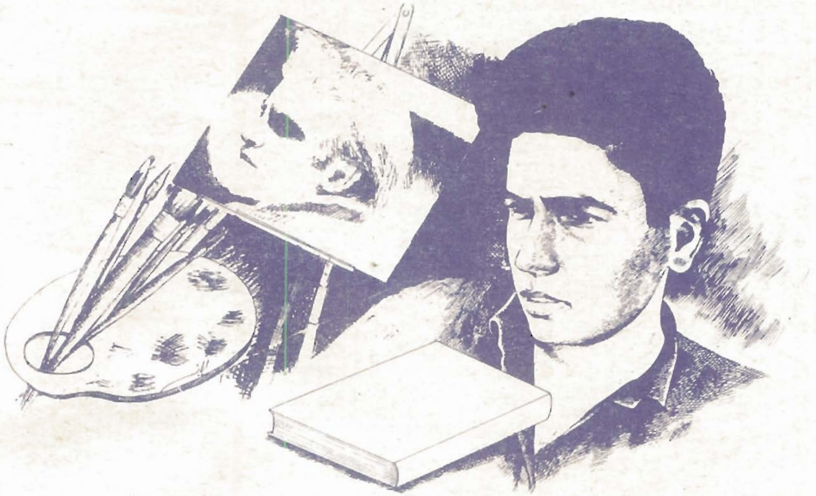

سبق

شبانہ رشید

جو لوگ خود کام نہیں کرتے وہ دوسروں کے کاموں میں بھی خامیاں ڈھونڈتے رہتے ہیں۔
ایک ایسے آرٹسٹ کی کہانی جو لوگوں کی باتوں سے مایوس ہو کر تصویر بنانے کا فن بھول بیٹھا تھا...

حیدر نے زبردست کوشش کے بعد ایک تصویر بنا ہی ڈالی پھر وہ اپنی بنائی ہوئی تصویر گھر والوں کے سامنے لے گیا۔ تصویر دیکھ کر ہر کسی نے اس کی کوشش کی داد دی۔ امی نے پیار کیا' ابو جان نے شاباشی دی' ماموں جان اور دادا جان نے تو بہت تعریف کی۔ تصویر واقعی تھی ہی بہت خوبصورت --- اتنی بہت ساری تعریفیں سُن کر حیدر خوش ہو گیا۔ اس کا خیال تھا جب وہ یہ تصویر اپنے دوستوں کو دکھائے گا تو سب خوش ہوں گے۔
حیدر نے جب دوستوں کو اپنی بنائی ہوئی تصویر دکھائی تو سب ناک بھوں چڑھانے لگے۔
"خاک اچھی تصویر بنائی ہے تم نے؟"
"ہم تو سمجھے کوئی شاہکار تخلیق کیا ہوگا۔"
"مجھے تو تمہاری تصویر دیکھ کر ہی ڈر لگ رہا ہے۔"

"یار! کیا بھونڈا مذاق کیا ہے تم نے!" ہر ایک نے الگ رائے دی۔ "کیا واقعی تصویر اچھی نہیں بنی؟ ۔۔۔ تو پھر گھر والوں نے کیوں تعریف کی تھی ۔۔۔ شاید میرا دل رکھنے کے لئے!!" حیدر بجھ سا گیا۔

ڈرائنگ کرنا اور پینٹنگز بنانا اس کے شوق تھے گو ان چیزوں میں اسے مہارت حاصل نہ تھی مگر چونکہ خداداد صلاحیت تھی اس لئے اچھا کام کرتا تھا ۔۔۔۔ دوستوں کی باتوں نے اس پر مایوسی طاری کردی۔ اب جب وہ برش ہاتھ میں اُٹھاتا' یہ سوچ کر رکھ دیتا کہ اسے کچھ بھی بنانا ہی نہیں آتا۔ اس کام سے دل برداشتہ ہوجانے کے بعد وہ کتابیں پڑھنے لگتا۔ ایک دن اس نے کتاب میں ایک واقعہ پڑھا۔ لکھا تھا : "ایک آرٹسٹ نے ایک بہت ہی خوبصورت تصویر بنائی وہ چاہتا تھا کہ اگر اس تصویر میں کوئی خامی رہ گئی ہو تو وہ بھی نکل جائے اس آرٹسٹ نے اپنے خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اس تصویر کو شہر کے بیچ ایک چوراہے پر لٹکا دیا اور اس کے نیچے لکھا "اس تصویر میں جس کو جو خامی نظر آئے اس پر نشان لگادے۔ دوسرے دن جب اس نے تصویر دیکھی تو پوری تصویر نشانات سے بھری پڑی تھی اور اصل تصویر کہیں چھپ گئی تھی یہ دیکھ کر وہ آرٹسٹ بڑا مایوس ہوا لیکن اس کے ایک اچھے دوست نے مشورہ دیا کہ ایسی ہی ایک اور تصویر بناؤ۔ لہٰذا اس نے ایک اور تصویر بنا ڈالی۔ پھر اس کے دوست نے کہا "اب اسے وہیں پر لٹکا دو جہاں پہلے لٹکایا تھا اور نیچے یہ عبارت لکھو "اس تصویر میں آپ کو جو خامی نظر آئے برائے مہربانی اسے درست کردیا جائے ۔۔۔۔!!"

دوسرے دن جب وہ آرٹسٹ اپنے دوست کے ساتھ تصویر دیکھنے پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس پر ایک نشان تک نہ تھا اور تصویر ویسی ہی تھی جیسی کہ اس نے بنائی تھی۔ آرٹسٹ کا دوست یہ دیکھ کر مسکرایا پھر آرٹسٹ سے بولا۔ "میرے دوست دنیا میں غلطیاں نکالنے والے ہزاروں ہیں لیکن غلطیاں نکال کر درست کرنے والا کوئی نہیں۔" حیدر نے یہ واقعہ پڑھا تو سوچوں میں گم ہوگیا۔

پھر ساری بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے برش اٹھایا اور ایک اچھی سی تصویر بنانے لگا۔ یہ سبق اسے مل گیا تھا کہ جو لوگ خود کام نہیں کرتے وہ دوسروں کو بھی کام کرتا دیکھ کر کبھی خوش نہیں رہتے!!

کہانی مقابلہ کے نتائج

پاکستان کے وقار کو بلند رکھنا اور مہنگائی کو ختم کرنا ملک کے پالیسی ساز اداروں اور حکومت کا کام ہے لیکن مہنگائی اور ملک دشمنوں سے لڑنے کے لئے ادیبوں اور شاعروں کو بھی قلم کے ذریعے جہاد کرنا ہوگا۔۔۔ ہمیں خوشی ہے کہ پاکستان کا مستقبل محفوظ ہے کیوں کہ اس کے بچے اور نوجوان اپنے اسلامی تشخص، اپنے وطن اور اپنے عوام سے محبت کرتے ہیں۔۔۔ کہانی مقابلے میں ان کی تحریریں ان کے سچے جذبوں اور دلی امنگوں کی آئینہ دار تھیں۔۔۔ کاش کہ ہمارے خود غرض حکمراں اور مفاد پرست سیاستدان بھی وطن اور عوام سے محبت کرنا سیکھ سکیں!!!

کہانی مقابلہ میں ہمیں سینکڑوں کہانیاں موصول ہوئیں۔ کہانیوں کو زبان وبیان، دلچسپ انداز اور مسائل کو حل کرنے کے حوالے سے نمبر دیئے گئے۔ چھ دلچسپ، مزے دار کہانیاں اس مقابلے کی شرائط پر پوری اُتریں...... انعام حاصل کرنے والے لکھاری درج ذیل ہیں:

محمد اجمل انصاری، قاسم بن نظر، ہُما عظمت، سعد اللہ، آصف اقبال، خیر النسا شیخ

جن ساتھیوں کی تحریریں مقابلے میں انعام حاصل نہ کرسکیں انہیں مایوس نہیں ہونا چاہئے ان میں لکھنے کی بہت اچھی صلاحیت موجود ہے۔۔۔ آئندہ جو مقابلے ہوں گے انہیں اس میں اپنی صلاحیتوں کو آزمانے کا بھرپور موقع ملے گا اور ہوسکتا ہے آئندہ انعام ان کی تحریر کو ہی ملے۔۔۔ انعام یافتہ ساتھیوں کے انعامات عنقریب روانہ کردئے جائیں گے۔

کہانی مقابلہ کے شرکا

سعدیہ حمید، گوجرانوالہ۔ کاشف لطیف، ہزارہ۔ مدثر ریاض، تلہ گنگ۔ عبد القدیر انڈھڑ، پنوں عاقل۔ صائمہ اکرم، صادق آباد۔ ہما شریف، کراچی۔ طاہرہ مشتاق، پشاور۔ اظہر کمال، کراچی۔ رحمت اللہ بشیر، گجرات۔ سموئیل سروش، کراچی۔ اسد علی خان، کراچی۔ نیر فاروق، راولپنڈی۔ محمد علی چوہدری، کراچی۔ شیر محمد رحمانی، نوابشاہ۔ منصور احمد مگسی، کندھ کوٹ۔ محمد عثمان صدیقی، کراچی۔ شیر نواز گل، پشاور۔ رانا عبد الجبار شیخ، لاڑکانہ۔ زبیدہ کاظمی، جھمبڑ سندھ۔ عندلیب زہرہ، راولپنڈی۔ خرم طارق جگنو، گوجرانوالہ۔ نشاط رینہ، ملتان۔ عاطف حسن صدیقی، کراچی۔ نازیہ صلاح الدین، حیدر آباد۔ حماد عارف ہاشمی، راولپنڈی۔ سعدیہ آفتاب، تلہ گنگ۔ سیدہ شہربانو، سید شہریار، رحیم یار خان، نعمان محمود کاشمیری، گوجرانوالہ۔ سیدہ عابدہ تنویر، ڈیرہ اسماعیل خان۔ ثناء اعجاز، کراچی۔ شہریار گل، پشاور۔ عماد حسین یاد، لاہور۔ سید نثار الحسنین، ڈیرہ اسماعیل خان۔ الیس عرفان آفاق، کراچی۔ وقاص حسین، مردان۔ عفیفہ اطہر، حیدر آباد۔ منور احمد صدیقی، کراچی۔ محمد سلیم خان، کراچی۔ محمد ابصار عالم، بدین۔ محمد یوسف گل، کراچی۔ کاظم ذہین، کراچی۔ محمد ادریس داؤد، پشاور۔ امجد، ضلع ایبٹ آباد۔ شمس الدین التمش، دوآبہ۔ حسیب احمد، جہلم۔ کریم دلاور خان، کراچی۔ صدف بتول، صادق آباد۔ کاشف لطیف، مانسہرہ۔ محمد جنید انصاری، کراچی۔ کہکشاں انجم، افشاں انجم، کراچی۔ صبا قادر، کراچی۔

انعام یافتہ کہانیاں اگست کے شمارے سے شائع کی جائیں گی۔ نئے مقابلے کا اعلان بھی اگست میں ملاحظہ فرمائیے!

کوپن برائے سالانہ خریداری

نام ________________

مہینہ جس سے سالانہ شروع کروانا چاہتے ہیں ________________

رقم ________________ بذریعہ ________________

پتہ ________________

فون نمبر ________________

کوپن برائے "ہیرو کے مہمان"

نام ________ تاریخ پیدائش ________ جماعت ________

تعلیمی ادارہ ________________ مشغلہ ________

پتہ ________________

____

کوپن برائے "تحفہ آنکھ مچولی"

میرے دوست کا نام ________________

جماعت ________________

گھر کا پتا ________________

____

کوپن برائے "سب سے بہترین"

سب سے اچھی کہانی ________________ مصنّف ________

سب سے اچھی نظم ________________ شاعر ________

بھیجنے والے کا نام اور پتا ________________

____

سُنا ہو تو سُنائیے

دیکھا ہو تو بتائیے

کوئی ایسا ماہنامہ

جِس نے

◎ منفرد موضوعات پر ہر سال ڈیڑھ خاص نمبر شائع کیے ہوں۔

◎ جس کی سطر سطر تحقیق اور لفظ لفظ تخلیق سے عبارت ہو۔

◎ جِس کے خصوصی شمارے اپنے موضوعات پر مُستند کتاب کی طرح مستقل علمی حوالہ بن گئے ہوں۔

◎ جِس نے اپنے خاص نمبر کے ساتھ انوکھے اور حسین تحائف دینے کی رسم ڈالی ہو۔

◎ اور جس نے مختصر ترین وقت میں لامحدود اشاعت کا ریکارڈ قائم کیا ہو۔

اگر آپ ایسا ماہنامہ کہیں تلاش کر پائیں تو ہمیں ضرور مطلع کریں

ماہنامہ
آنکھ مچولی

1- پی آئی بی کالونی، کراچی ۵

میرا شہر مر رہا ہے

سعدیہ ریاض

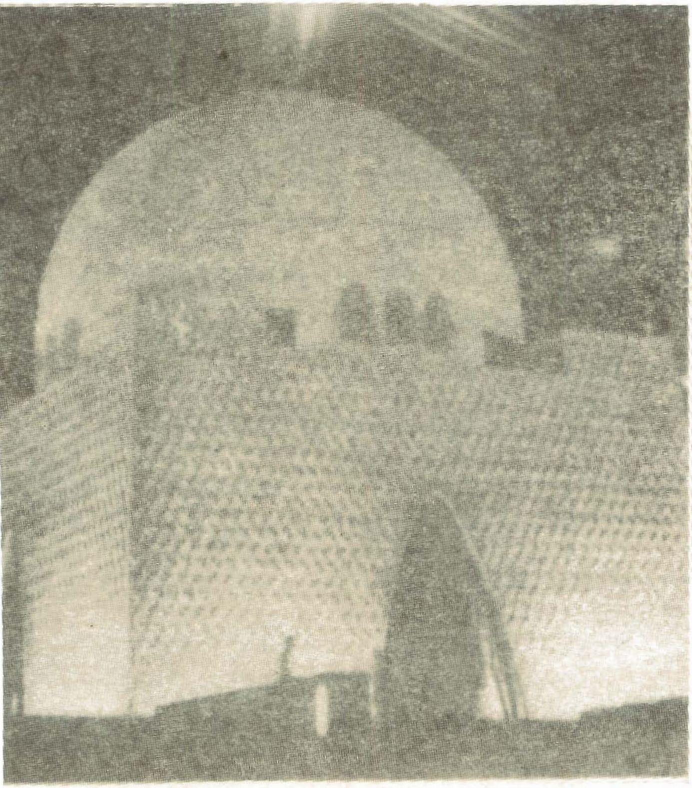

وہ شہر
جو کبھی
روشنیوں کا تھا مسکن
رنگوں اور خوشبوؤں کا
آج مر رہا ہے!!
گولیوں کی ژالہ باری
انسانوں کے شکاری
ہولی لہو کی کھیلتے ہیں
ماؤں سے ان کے بیٹے
بہنوں سے ان کے بھائی
بچّوں سے ان کے ابو
چھینتے ہیں!!
میرا پیارا دوست احمر
اک دن نماز پڑھنے
اللہ کے گھر گیا تو
شکاریوں نے اس کو
اور کچھ نمازیوں کو
لہو میں نہلا ڈالا
لوگ مر رہے ہیں
میرا دوست مر گیا ہے
میرا شہر مر رہا ہے !!!

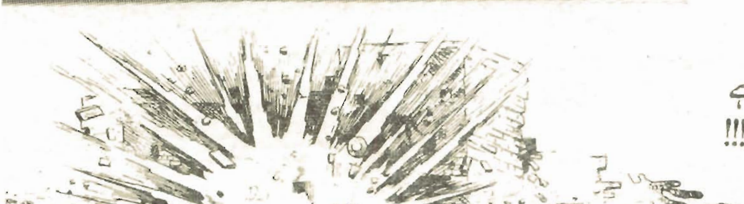

آخری بات

اورنگ زیب عالمگیرؒ بڑا خدا ترس اور عوام دوست بادشاہ تھا ایک بار شکار پر نکلا تو رستہ بھٹک کر کسی گاؤں میں جا نکلا۔ سخت پیاس لگ رہی تھی۔ ایک دہقان نے اسے کنوئیں سے پانی کھینچ کر پلایا۔ اورنگ زیب نے اسے اپنی انگوٹھی دے دی اور کہا۔ "جب تمہیں کوئی پریشانی یا حاجت ہو تو میرے پاس چلے آنا میں تمہاری مدد کروں گا۔"

کچھ ہی دنوں بعد دہقان کی فصل خراب ہو گئی۔ وہ دانے دانے کو محتاج ہو گیا چنانچہ شاہی انگوٹھی لے کر دربار جا پہنچا۔ دربانوں نے اسے بادشاہ تک پہنچادیا۔ بادشاہ اس وقت نماز پڑھ کر دُعا مانگ رہا تھا۔ دہقان نے جب یہ دیکھا تو واپس جانے لگا۔ دربانوں نے روکا اور پوچھا۔ "واپس کیوں جاتے ہو؟" دہقان نے کہا۔ "میں تمہارے بادشاہ سے کچھ مانگنے آیا تھا لیکن وہ تو خود محتاج ہے مجھے کیا دے گا۔۔۔۔ مجھے اسی سے مانگنا چاہئے جس سے سب مانگتے ہیں۔"

ایسی ہی بات شیخ سعدی رحمتہ اللہ علیہ نے اس وقت کہی تھی جب کہ ملک میں قحط پڑا ہوا تھا اور لوگ درختوں کے پتے چبا چبا کر گزر بسر کر رہے تھے۔ ایسے وقت کسی امیر شخص نے لوگوں کو کھانا کھلانا شروع کر دیا۔ شیخ سعدی رحمتہ اللہ علیہ کے شاگردوں نے کہا کہ "حضرت! ہم بھی اس شخص کے دسترخوان پر چلتے ہیں۔" مگر شیخ سعدی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔ "شیر بھوکا مرجاتا ہے مگر کسی جانور کا جھوٹا نہیں کھاتا۔"

ان دو واقعات میں دوسروں کے آگے وقت بے وقت ہاتھ پھیلانے والوں کے لئے سبق پوشیدہ ہے کہ کوئی کسی کو نہیں کھلاتا صرف اللہ ہی ہے جو سب کو کھلاتا ہے اور اسی کے اختیار میں ہے کہ وہ سب کو دیتا ہے۔

ہمیں اللہ تعالٰی کے سوا کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلانا چاہئے۔۔۔!!

شربت نورس انتہائی کاوش، جدید ترین مشینری کی مدد اور ماہرین کی انتھک کوششوں کو یکجا کر کے سائنٹیفک اصولوں کے تحت تکمیل کو پہنچا ہے۔ نورس کا ذائقہ ہی اس کی خوبی نہیں بلکہ اس کا ایک ایک گھونٹ مفرح اور صحت بخش ہے۔ اسے دودھ، آئس کریم، کسٹرڈ اور قلفی میں استعمال کرنے سے لذت دوبالا ہو جاتی ہے اور موسم برسات میں تازہ لیموں کے ساتھ نورس فریش لائم موسم کے مضر اثرات سے محفوظ رکھتا ہے۔

نورس قومی مشروب

احمد فوڈ انڈسٹریز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
ڈی-112، نورس روڈ، سائٹ، کراچی 75700
فیکس: 021-2564570
فون نمبر: 2563520 (5 لائنیں)

ORIENT

REGD. No. M-266 JULY 1995
MONTHLY AANKH MICHOLEE KARACHI